خیز موضوعات پر دنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب
جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
خاص نمبر
Jam 80

جاسوسی ڈائجسٹ

۸ — قیامت زدہ — محی الدین نواب

انعامی کہانی۔ تحیر و تجسس کا حسین امتزاج۔ اس کہانی پر مصنف کو پانچ ہزار روپے کا انعام دیا گیا ہے

۶۷ — تلپٹ — عماد بجون

اس مجرم کا قصہ جس نے اپنے ہم شکل سے اپنے جرم کا سودا کر لیا تھا۔ پولیس والوں کی نفسیات پر ایک دلچسپ تحریر

۷۰ — مفرور — ایم سلیم

ایک کیمیاگر کی زندگی کے سنسنی خیز واقعات۔ حصول مقصد کے لیے ایک شخص کی جدوجہد کی عبرتناک داستان

۱۱۳ — ناقابلِ اشاعت — اقبال پاریکھ

آپ کے جانے پہچانے اور اپنے وقت کے عظیم مصنف کارنل ارلچ کی خوبصورت تحریر۔ خاص نمبر کے لیے اقبال پاریکھ کا حسین انتخاب

۱۲۵ — متخیل — پرویز اختر

ہوس پرستی کی خاطر دوسروں کی زندگی داؤ پر لگانے والے شخص کی کہانی وہ اس آدمی کو نظرانداز کر گیا تھا جو ایسے مواقع پر اچانک ہی نمودار ہو جاتا ہے

۱۲۸ — جلدباز — وسیم خاتون

منصوبہ بہت اچھا تھا اور طریقۂ کار بھی مناسب لیکن اس بے صبری کا کیا علاج جو اکثر اوقات کام بگاڑ دیتی ہے

۱۳۱ — دوسرا رخ — ش م جمیل

واقعات کا ایک رخ تو وہ ہے جو انسان خود دیکھتا ہے دوسرا رخ اسے وقت دکھاتا ہے۔ ایک شوہر کا قصہ جو دوسرا رخ دیکھ کر دم بخود رہ گیا تھا

۱۳۷ — تختِ سلیمان — محمود احمد

تحیر، تجسس اور پراسرار واقعات سے بھرپور اس ناول کا انتخاب خاص طور پر جاسوسی ڈائجسٹ نمبر کے لیے کیا گیا ہے

۱۷۷ — بھڑاس — منیر صدیقی

بچوں کو بالکل نا سمجھ، غور و فکر سے عاری اور بے شعور سمجھنے والوں کے لیے ایک فکر انگیز کہانی۔ مشہور مصنف البرٹو موراویا کی خوبصورت تحریر

۱۸۰ — خمیر — اثر نعمانی

مجرموں کی سرکوبی کرتے کرتے اچانک جبران کو ایک نئی سوجھ گئی ہے۔ ذرا دیکھیے تو سہی کہ اس عجیب و غریب صورتحال کا انجام کیا ہوا

۲۱۲ — پربتوں کے سائے میں

ہندوستان میں پرورش پانے والے ایک انگریز نواب زادے کی ایڈونچر سے بھرپور سنسنی خیز کہانی۔ ریاستی سازشوں کی دلچسپ داستان

۲۳۵ — حالات کے قیدی — نسیم اقبال

ہولناک عالمی جنگ کا ایک نیا رخ۔ ایک دوسرے کے جانی دشمن دو ہوابازوں کا قصہ جو انسانیت سے بالکل ہی عاری تھے۔ ایک خیال انگیز تحریر

۲۷۵ — جرم شناس — احمد منیر صدیقی

شکار سامنے ہو اور جال تیار ہو تو شکاری سوچنے میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ اس کہانی میں شکار کون ہے اور شکاری کون

۲۶۸ — خود گزیدہ — شائستہ

ان لوگوں کا قصہ جنہوں نے حالات کے رخ کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ سرورق پر ایک دل گداز کہانی

۲۹۰ — دریابرد — ماہ نور

ایک نوجوان کا قصہ جس نے مستقبل کا حال جاننے کی کوشش کی تھی۔ سرورق کی دوسری کہانی

۳۰۷ — خوگرفتہ — ابن شباب

جیسے ہی آپ اس کہانی کو شروع کریں گے آپ کے اور مصنف کے درمیان ذہنی جنگ شروع ہو جائے گی۔ سرورق پر اس ماہ کی تیسری کہانی

پبلشر: معراج رسول ـ مقام اشاعت: ۶۳-سی بلاک ایچ، نارتھ ناظم آباد کراچی ـ پرنٹر: منظور احمد خان ـ مطبوعہ: جاوید پریس، آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

جلد ۱ شمارہ ۱۰ جنوری ۸۰ء قیمت ۱۰ روپے زر سالانہ مع رجسٹری خرچ ۱۲۰ روپے خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس ۲۲۰ کراچی

لیجئے جناب: اعلان کے مطابق جاسوسی ڈائجسٹ کا خاص نمبر حاضر ہے۔ اس خاص نمبر کو حقیقی معنی میں خاص نمبر بنانے اور وقت پر آپ کے ہاتھوں میں پہنچانے کے لئے ہم نے دن رات محنت کی ہے۔ اس کا کچھ اندازہ وہ لوگ بہتر طور پر کر سکتے ہیں جو کسی امتحان کی تیاری کر رہے ہوں اور امتحان کی تاریخ قریب ہو۔ ہمارے لئے بھی یہ خاص نمبر ایک امتحان کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمارے ممتحن لاکھوں قارئین ہیں۔ ایک دو ممتحنوں کو مطمئن کرنا تو آسان ہے لیکن لاکھوں ممتحنوں کو مطمئن کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اس امتحان کو ہم نے کتنے نمبروں سے پاس کیا ہے اس کا اندازہ تو آپ کے خطوط ہی سے ہو سکتا ہے۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اپنی طرف سے ہم نے کوئی کمی نہیں رہنے دی ہے۔

جاسوسی ڈائجسٹ کے نمبر کی تیاری کی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے، انعامی مقابلے میں حصہ لینے والے حضرات اور بعض دوسرے معترضین اور متعلقہ افراد کو خطوط کے جواب نہ دیئے جا سکے ان سے معذرت خواہ ہیں۔ نمبر نمٹ چکا ہے۔ اب جواب میں تاخیر نہیں ہوگی۔ اور اب آپ اپنے خطوط ملاحظہ فرمائیں۔

گوجرانوالہ سے ذوالفقار علی بٹ صاحب لکھتے ہیں: "اس سے پہلے کئی دفعہ خط لکھنے کی کوشش کی لیکن اپنی سستی کی وجہ سے حاضر خدمت ہونے سے قاصر رہا۔ معذرت خواہ ہوں۔ اس ماہ کا جاسوسی بہت بہترین رہا میں چھ سات سال سے اس کا قاری ہوں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے بھی سسپنس کی طرح نمبر نکالنے کا انتظام کر لیا ہے۔ کیسا ہوگا یہ تو پڑھنے پر ہی پتہ چلے گا۔ اس دفعہ معزور بھی رہی۔ آپ فاضل مصنف سے کہہ کر اس کے کچھ صفحات بڑھا دیں۔ پرتوں کے سائے میں شروع سے لے کر اب تک بہت ہی اچھی جا رہی ہے میں ایک شمارے میں اس کو چھ سات مرتبہ پڑھتا ہوں۔ مصنف صاحب کو اتنی اچھی کہانی لکھنے پر اور آپ کو شائع کرنے پر مبارک باد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ جبران صاحب بھی حسبِ سابق بہترین ہیں۔ دوسری کہانیاں بھی خوب ہیں......"

ذوالفقار صاحب، آپ کے خط کا شکریہ! جاسوسی ڈائجسٹ کا دسمبر کا شمارہ آپ کو پسند آیا ہمارے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ معزور کے صفحات کے بارے میں تو اب کچھ کہنا فضول ہی ہے۔ البتہ اس نمبر کے لئے اقلیم علیم صاحب نے بھی بڑی ہمت کی ہے اور اعلان کے مطابق معزور ۴۵ صفحات کی تو نہیں البتہ تقریباً ۴۰ صفحات کی ضرور کر دی ہے۔ اس لئے وہ ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں۔ دیگر کہانیوں کی پسندیدگی کا شکریہ! اقتباس جو آپ نے بھیجا ہے کچھ زیادہ دلچسپ محسوس نہیں ہوا۔ اس لئے اس کے سلسلے میں معذرت قبول فرمائیے۔

سیالکوٹ سے حاکم علی صاحب لکھتے ہیں: "دسمبر کا شمارہ پڑھا۔ چیلنج فنڈ پڑھ کر یقین نہیں آیا کہ یہ نواب صاحب کی تخلیق ہے۔ ایسی تحریر تو نواب صاحب نے کبھی نہیں لکھی تھی۔ یہ کردار کہاں ہیں اور ایسے کلب؟ کچھ بھی تو ذہن نے تسلیم نہیں کیا۔ شاید ایسی کہانی نواب صاحب نے محض نام کی خاطر لکھ دی۔ گرگ آشتی اور دو طرفہ بہترین تھیں۔ معزور کی موجودہ قسط بھی مزیدار تھی۔ خاص نمبر کا اعلان پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ہاں یہ غزلوں سے معاف ہی فرمایئے۔ غزلوں کے لئے اور بہت سے رسالے ہیں۔ اس دفعہ لطیفے بہت کم تھے آپ لطیفوں پر بھیجنے والوں کا نام نہیں دیتے کیا وجہ ہے؟ نام دیا کریں نا.....!"

حاکم علی صاحب، گرامی نامے کا شکریہ! نواب صاحب کی کہانی آپ کو پسند نہیں آئی اس کا ہمیں افسوس ہے ویسے ذیل میں رحمان خان صاحب کا خط پڑھ لیں ایک حد تک انہوں نے ہماری طرف سے جواب دے دیا ہے۔ خیر ناراضگی چھوڑیں اور اس نمبر میں نواب صاحب کی انعام یافتہ کہانی پڑھ لیں۔ آپ کی تمام شکایات دور ہو جائیں گی۔ گرگ آشتی، دو طرفہ اور معزور کی نئی قسط کی پسندیدگی کے لئے ہم بہرحال آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جی ہاں آپ جیسے قارئین ہی کی وجہ سے ہم نے غزلوں کے سلسلے میں معذرت کر لی تھی۔ لطیفوں پر ہم بھیجنے والوں کا نام ضرور دیتے ہیں بشرطیکہ بھیجے گئے ہوں۔ ادارے سے منسلک لوگ جو لطیفے دیتے ہیں ان پر البتہ کوئی نام نہیں دیا جاتا۔

رحمان خان صاحب، فیصل آباد سے رقم طراز ہیں: "نومبر کے شمارے میں آپ نے میرے خط کا جواب دیا میں نہایت شکر گزار ہوں۔ اب تو جی کرتا ہے کہ ہر ماہ لکھتا رہوں لیکن پھر سوچتا ہوں کہ تنگ آ کر کہیں آپ خط کھولنے سے پہلے ہی ردی کی ٹوکری میں نہ ڈال دیں۔ اس دفعہ سرورق پسند آیا۔ کہانیاں تو تقریباً سب ہی اچھی ہیں لیکن مہنگا سودا اور چیلنج فنڈ کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اثر نعمانی، محی الدین نواب اور اقلیم علیم صاحبان کو اتنی اچھی کہانیاں لکھنے پر میری طرف سے مبارک باد دیں۔ خاص نمبر کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔"

نانا نا۔ رحمان خان صاحب یہ بات آپ کبھی تصور میں بھی نہ لائیے گا کہ ہم بند لفافہ ردی کی ٹوکری کے حوالے کر دیں گے۔ ہم خط کھولتے ضرور ہیں اور پڑھتے بھی ہیں البتہ بعض خطوط پورے نہیں پڑھتے۔ ویسے یہ بات صحیح ہے کہ ہر ماہ خط لکھنے کی صورت میں ہر خط کا جواب دینا ہمارے لئے مشکل ہے۔ سرورق، مہنگا سودا اور چیلنج فنڈ کی پسندیدگی کا شکریہ قبول فرمائیے۔ لیجئے خاص نمبر کا آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

منظور احمد صاحب۔ سعودی عرب۔ آپ جو کہانیاں بھیجنا چاہیں بھیج دیں۔ جاسوسی ڈائجسٹ جاری کرنے کے سلسلے میں آپ کو تفصیلی خط سرکولیشن ڈپارٹمنٹ کی طرف سے جلد ہی موصول ہوگا۔ لطیفہ تو بار بار کا چھپا ہوا ہے اس لئے معذرت ــــ اکرم ملک صاحب میانوالی۔ لافانی کی اشاعت کے سلسلے میں ہماری معذرت قبول فرمائیے۔ محمد رمضان صاحب۔ ایبٹ آباد۔ آپ کہانی بھیج دیں قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ سید ظفر واسطی صاحب۔ لاہور کینٹ! گرامی نامہ اور کہانی مل گئی تھی۔ تفصیلی خط ان شاءاللہ دو چار روز میں آپ کو مل جائے گا۔ ایم خالد صاحب لاہور۔ "اونچے لوگ" کی اشاعت کے لئے معذرت قبول فرمائیے۔ کوثر پروین صاحبہ۔ فریبی کی اشاعت سے ہمیں معذور سمجھیں۔ معذرت! خالد جاوید ہاشمی صاحب۔ آپ کی بے نام کہانی شائع کرنا مشکل ہے اس لئے معذرت قبول فرمائیے۔ طاہر سلیم صاحب۔ فیصل آباد۔ آپ کی پہلے کی کہانیاں بھی شائع نہیں ہو سکی تھیں اور دوسری چال بھی۔ ان کہانیوں کے سلسلے میں معذرت قبول فرمائیے۔ محمد حنیف شاکر صاحب، آزاد کشمیر۔ آپ کے روانہ کردہ لطیفوں میں سے ایک شائع ہو جائے گا۔ محمد جمیل ملک صاحب بہاولپور کینٹ۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لئے ہم آپ کا اور آپ کے اسٹاف کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ تصویروں کے ریکارڈ کا چونکہ کوئی انتظام نہیں ہے اس لئے اس بارے میں معذرت قبول فرمایئے۔ سید الطاف حیدر صاحب مرداں۔ آپ کے لطائف مل گئے ہیں ایک قابل اشاعت ہے۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی کسی آئندہ اشاعت میں شامل کر لیا جائے گا۔ مہنگا سودا، چیلنج فنڈ اور شریف ساتھی کی پسندیدگی کا شکریہ۔ بحر گزشت کے بارے میں چند اور قارئین نے بھی خطوط لکھے ہیں۔ عرض یہ ہے کہ غیر ملکی کہانیوں کے تراجم مختلف لوگ کرتے ہیں اور مختلف ڈائجسٹوں میں یہ کہانیاں شائع ہوتی ہیں کبھی کبھی دو چار سال میں ایسا اتفاق ہو جاتا ہے کہ ایک ہی کہانی بیک وقت دو مترجم ترجمہ کر کے دو مختلف رسالوں کو دے دیتے ہیں اور وہ ایک ساتھ دونوں رسائل میں شائع ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کسی ڈائجسٹ کو یہ علم نہیں ہو سکتا کہ دوسرے ڈائجسٹ میں اس ماہ کونسی کہانیاں شائع ہو رہی ہیں تا آنکہ ڈائجسٹ مارکیٹ میں نہ آ جائے۔ امید ہے کہ اب آپ لوگوں کی تسلی ہو گئی ہوگی۔ بشیر احمد صاحب، لالہ موسیٰ، جاسوسی ڈائجسٹ کی غیر معمولی پسندیدگی کے لئے ہمارا شکریہ قبول فرمائیں۔ خط آپ ۱۵ تاریخ تک لکھ سکتے ہیں (دوسرے تمام قارئین بھی نوٹ فرمالیں) شہزادہ رفیع جوہر صاحب لاہور چھاؤنی۔ "ہاتھ کی صفائی" کے لئے معذرت قبول فرمائیں۔ دیگر کہانیوں کا انتظار رہے گا۔

اس شمارے میں اثر نعمانی کی کہانی خمیر، ماہ نور کی کہانی دریا بُرد اور محی الدین نواب کی کہانی قیامت زدہ، انگریزی سے ماخوذ ہیں۔

اور اب، جن قارئین کے خطوط کے جواب نہ دیئے جا سکے ان سے معذرت کے ساتھ اگلے ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

(احمد سعید)

اظہارِ تشکر

میرے والد شیخ عبدالغفار کے سانحۂ ارتحال پر جن احباب اور قارئین نے اظہارِ تعزیت کیا میں ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ چونکہ فرداً فرداً ان سب کا شکریہ ادا کرنا میرے لیے ممکن نہیں لہٰذا ان سطور کا سہارا لے رہا ہوں۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

معراج رسول

قیامت وہ

محی الدین نواب

چار ماہ پہلے ہم نے انعامی کہانی پر پانچ ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا تھا۔ اس عرصہ میں تقریباً ستر کہانیاں موصول ہو چکی ہیں جن میں چھ کہانیاں قابلِ اشاعت ہیں اور صرف دو کہانیاں انعام کی مستحق ہیں
ان دو میں سے ایک کہانی پیش کی جا رہی ہے۔ زیرِ نظر کہانی کی تعریف میں ہم ایک لفظ بھی نہیں کہیں گے۔ کہنا آپ کو ہے کہ اس کہانی کو ہم نے انعام کا مستحق قرار دے کر غیر جانبداری اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا ہے یا نہیں؟
آپ کے تنقیدی خطوط ہمارے آئندہ فیصلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے

ایک قیامت وہ ہے جو دل پہ گزرتی ہے، اور ایک قیامت وہ ہے جو دنیا پہ گزرتی ہے۔
ہمت راؤ نے اسپیس ویژن کی اسکرین پر سوئی کی نوک کے برابر اس قیامت کے نقطہ کو دیکھا جو ایٹم کے آخری ذرے کی طرح حقیر بھی تھا، اور خطرناک بھی اور وہ زمین کی طرف یوں آ رہا تھا جیسے قیامت آتی ہے۔
ماہرِ فلکیات ہمت راؤ کی زندگی کا زیادہ حصہ گرین وچ کی آبزرویٹری میں گزرا تھا۔ اس کی تیز چبھتی ہوئی نگاہیں اور چہرے

اس کہانی پر مصنف کو پانچ ہزار روپے انعام دیا گیا ہے

کی تجربہ کار شکنیں ظاہر کرتی تھیں کہ وہ جوانی سے بڑھاپے تک خلاء کی کتنی ہی شکنوں سے گزرتا رہا ہے اور فلکی اجسام کی ناقابلِ فہم تواریخ کو کھنگالتا رہا ہے۔
پینتالیس برس کی عمر میں وہ بھارت واپس آگیا تھا، اور تین برس سے مدراس کی آکاش بھون آبزرویٹری میں اپنی خدمات انجام دے رہا تھا۔ اس روز اسپیس ویژن گرام رخلائی خاکہ) میں اس نقطہ کو ایک اشارہ کی طرح جلتے بجھتے دیکھ کر اس کے دماغ کو ایک جھٹکا پہنچا۔ اسے یاد آیا کہ اس آنے والی قیامت کی اطلاع اسے پہلے ہی مل چکی تھی۔ وہ اطلاع کس نے دی تھی؟
اس نے فوراً ہی میز کے پاس آکر پچھلے دن کا ایک اخبار اٹھایا وہ پاکستان سے شائع ہونے والا ایک انگریزی اخبار تھا۔ اس کے آخری صفحہ پر عالمی شہرت یافتہ نجومی پروفیسر خورشید بلگرامی کا بیان شائع ہوا تھا کہ ایک دُمدار ستارہ شمسی مدار سے بھٹک گیا ہے اور اب اس کا رُخ ہماری زمین کی طرف ہے۔
ماہرِ نجوم پروفیسر خورشید بلگرامی نے باقاعدہ دُمدار ستارے کا زائچہ پیش کیا تھا۔ ہندسوں اور خطوط کے ذریعہ اپنی دانست میں مکمل حساب کیا تھا کہ آج سے ٹھیک بارہ ماہ ستائیس دن کے بعد ۲۸ دسمبر کو شام چھ بجکر بارہ منٹ پر وہ دُمدار ستارہ ہماری زمین سے ٹکرائے گا اور وہ دن ہماری دنیا کا آخری یا یومِ قیامت ہوگا۔
سر ہمت راؤ نے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا۔ فارن آفس کا نمبر ڈائل کرتے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے اپنا نام اور عہدہ بتایا۔ پھر وزارتِ خارجہ کے سیکرٹری سے فوراً ہی ملاقات کی درخواست کی۔ اس کے بعد ریسیور رکھ کر اس نے پاکستانی اخبار کو اپنے ایک اہم فائل میں رکھا اس کے اندر ایسی بے چینی اور ایسی بدحواسی تھی کہ وہ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آبزرویٹری کا کوئی بھی فرد آنے والی قیامت کو اس کے چہرے سے پڑھ سکے۔
اس نے کسی کا سامنا نہیں کیا۔ آبزرویٹری کے ٹیرس ہال سے لفٹ کے ذریعہ سیدھا نچلی منزل میں آگیا۔ مگر وہاں جوان بیٹے سے

سامنا ہوگیا۔ بیٹے نے اسے دیکھتے ہی بڑی بے چینی سے آگے بڑھ کر کہا۔

"پتاجی! میں اچھے سمے پر آگیا۔ نہیں تو آپ کہیں چلے جاتے! میں ایک بہت ہی چونکا دینے والی خبر لایا ہوں۔ آپ سنیں گے تو..."

"آں؟" ہمت راؤ ٹھٹھک گیا۔ وہ چونکا دینے والی خبر بوڑھے سینے میں ایک راز کی طرح دفن تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ راز بیٹے کی زبان سے فاش ہو رہا ہو۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"شنکر... شنکر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"آپ باہر چلیں میں بتاتا ہوں۔"

ہمت راؤ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"چلو، مگر میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ جلدی سے بتاؤ۔ میں ایک اہم میٹنگ کے لیے جا رہا ہوں۔"

"پتاجی! کچھ کہنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس قیامت کو دیکھ لیں۔"

بوڑھے کے اضطراب کو پھر جھٹکا لگا۔ اس وقت تک وہ عمارت سے باہر آگئے تھے۔ پورٹیکو میں ایک نئے ماڈل کی امپالا کے پاس ایک جیتی جاگتی قیامت کھڑی ہوئی تھی۔ پاؤں کی ایڑی سے سر کی چوٹی تک اس کا قد ایسا تھا جیسے جوانی اپنی انگڑائی کی اٹھان پر آکر جھک گئی ہو۔ سیاہ بارڈر والی نارنجی رنگ کی ساڑھی میں اس کی گوری رنگت نکھر رہی تھی۔ ندی کے لہراتے بدن پر چاندنی جھلملا رہی تھی۔ گلابی ہونٹ مہاراشٹر کے تاریخی دھنش کی طرح تراشیدہ تھے اور کندن سے ماتھے پر چندن کا ٹیکہ مسکرا رہا تھا۔

ہمت راؤ آبزرویٹری کی دوربین کے پیچھے سے آنکھیں پھاڑ کر خلا میں دیکھنے کا عادی تھا مگر قریب کی چیز کو آنکھیں سکیڑ کر دیکھتا تھا للہٰذا اس نے آنکھیں سکیڑ کر اس حسینہ کو دیکھا تو اس کے رخسار کے نیچے لبوں کے مسکراتے ہوئے گوشے کے پاس ایک ننھا سا سیاہ تل نظر آیا۔ وہ ننھا سا تل، وہ ننھا سا نقطہ اچانک ہی گلابی رخسار کے مدار سے بھٹک کر اسپیس ڈایاگرام میں پہنچ گیا۔ قیامت ادھر بیٹے کے دل پر آ رہی تھی۔ قیامت ادھر باپ کی دنیا میں بھی آنے والی تھی۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"کون ہے یہ؟ جلدی بتاؤ۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔"

"یہ روپ وتی ہے۔ آپ کی ہونے والی بہو۔ یہ باتیں یہاں نہیں ہو سکتیں۔ آپ کار میں بیٹھیں۔"

ہمت راؤ نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں اپنی کار میں جاؤں گا۔ اچھا ہوا تم آگئے۔ میں ذرا نروس ہو رہا ہوں۔ ڈرائیو نہیں کر سکوں گا۔ تم مجھے فارن منسٹر کی کوٹھی تک پہنچا دو۔"

"مگر پتاجی! میں روپ وتی کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ یہ آؤٹ آف ایٹی کیٹ ہے۔"

روپ وتی ایک قدم آگے بڑھی تو پھولوں کی ڈالی لچک گئی۔ وہ مسکرا کر ہاتھ جوڑتی ہوئی بولی۔

"شریمان نمستے! میں نے آپ کی بڑی تعریفیں سنی ہیں۔ آپ سچ مچ مصروف آدمی ہیں۔ شنکر تم اپنے پتاجی کے ساتھ آگے بڑھو، میں پیچھے آتی ہوں۔ منسٹر کی کوٹھی سے تم میری کار میں واپس آجانا۔"

شنکر نے چٹکی بجا کر کہا۔

"وہاٹ اے ٹیکر ومائزنگ آئیڈیا۔ روپ وتی تم بہت ذہین ہو۔ چلیے پتاجی۔"

وہ باپ کے ساتھ آکر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے کار اسٹارٹ کرنے کے بعد عقب نما آئینہ میں روپ وتی کو اپنی کار میں بیٹھتے دیکھا۔ پھر آئینہ کی طرف ایک ہوائی بوسہ اچھال کر اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔ باپ نے بیٹے کی جوان حرکتوں کو نہیں دیکھا۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار خلا میں تک رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔

یہ بات جنتا (عوام) کو نہیں معلوم ہونی چاہیے کہ وہ آسمانی بلا ہماری دھرتی سے ٹکرانے والی ہے۔ نہیں تو قیامت سے پہلے یہاں قیامت آجائے گی۔ دھرتی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک رونے گڑگڑانے کا شور گونجتا رہے گا۔ لوگ دہشت سے بدحواس اور پاگل ہو جائیں گے۔ آتما ہتیا کریں گے۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہوگا۔ انسان سے پہلے قانون مر جائے گا۔ تہذیب مر جائے گی۔ لوگ یا تو ایک دم سے دھرم کا پالن کرنے لگیں گے یا پھر بے دھرم ہو کر جانور بن جائیں گے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ راز کھل گیا تو کیا اندھیر مچے گا۔

"پتاجی!" بیٹے کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ "آپ کو بہو پسند آئی؟"

بہو، بیٹا، بیٹی، ناتی، پوتے۔ دہی صدیوں کا سلسلہ ایک بوڑھی دنیا کے بعد دوسری جوان دنیا۔ مگر اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ نئی نسل چار ماہ ستائیس دن کے بعد سانس لے سکے گی۔ وہ بوڑھی سانسوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گی۔

اسے اپنے جوان بیٹے پر بڑا ترس آیا۔ یہ جوانی کتنے دنوں کی رہ گئی ہے؟ اسے تو فوراً ہی شادی کرنی چاہیے۔ اس نے بیٹے سے کہا۔

"روپ وتی بہت اچھی ہے، بہت سندر ہے۔ کیا اس کے گھر والے آج ہی اس کا بیاہ کر سکتے ہیں؟"

کار کی رفتار اچانک ہی سست پڑ گئی۔ شنکر نے حیرانی سے پوچھا۔

"آ... آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آج یعنی کہ آج کا دن تو گزر ہی گیا۔ یعنی آپ کی اچھا (مرضی) ہے کہ آج رات ہی روپ وتی کو بیاہ لاؤں؟"

"ہاں بیٹے! اپنا جیون اپنا نہیں ہوتا۔ موت اسے ایک پل میں پرایا بنا دیتی ہے۔ تم تھوڑے سے سمے میں جتنی خوشیاں سمیٹ سکتے ہو سمیٹ لو۔"

"پتاجی! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ تو ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ کسی کام میں جلدی نہ کرو اور کسی کو دھرم پتنی بنانے کے لیے بڑے دھیرج سے اور بڑے سوچ بچار سے کام لو۔ دیکھیے آپ کسی اچھے خاندان کی لڑکی کو بہو بنانا چاہتے تھے مگر آپ برا نہ مانیں تو یہ اپنے اپنے دل کا معاملہ ہوتا ہے۔ روپ وتی میرے دل کو بھا گئی ہے۔ آپ کی کسوٹی کے مطابق بہت اچھے خاندان کی نہیں ہے۔ مگر آپ سے زیادہ مشہور ہے۔ ہماری بھارتی فلموں کی ٹاپ ہیروئن ہے۔"

ہمت راؤ کی پیشانی پر ایک لمحے کے لیے ناگواری کی شکنیں پڑیں۔ دوسرے ہی لمحے اس نے سمجھوتہ کر لیا۔

"ٹھیک ہے، کوئی بھی ہو کیسی بھی ہو، مگر جلدی سے بیاہ کر لو۔"

"پتاجی! آپ کو ہوا کیا ہے؟ آپ میری پسند کو مذاق میں تو نہیں ٹال رہے ہیں؟"

"میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ کسی فلمی ہیروئن کو اسی شرط پر بہو بناؤں گا کہ تم چوبیس گھنٹے کے اندر اس سے شادی کر لو گے۔"

"مائی گاڈ! آپ کی سنجیدگی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ او اچھا۔ بات کچھ کچھ پلے پڑ رہی ہے۔ میں سنتا آرہا ہوں کہ آپ بھی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ یہ تو اچھی بات ہے آپ کو اتنی خشک زندگی نہیں گزارنی چاہیے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میری شادی جلدی ہو جائے تو پھر آپ اپنے لیے سوچیں گے۔"

"یہ بات نہیں ہے شنکر۔"

"یہی بات ہے۔ آپ بیٹے سے خواہ مخواہ شرما رہے ہیں۔ یہ آپ کا زمانہ نہیں ہے پتاجی کہ بچوں کو شادی بیاہ کی باتوں میں شریک نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ ہمارا زمانہ ہے ہم اپنے بوڑھوں سے کہتے ہیں کہ بی میری اینڈ لاف۔ یہ ماڈرن زمانہ ہے۔ کوئی برا نہیں سمجھے گا۔ ہم دونوں ایک ہی دن شادی کر سکتے ہیں۔"

"او شنکر! کچھ میری بھی تو سنو۔ میں نے ابھی کسی کو پسند نہیں کیا ہے۔ تم پسند کر چکے ہو۔ اس لیے فوراً بیاہ کر لو۔"

"فوراً کیوں؟"

"بیٹے! یہ دنیا چند دنوں کی ہے۔"

"یہ تو ہم رامائن اور گیتا کے زمانے سے سنتے آرہے ہیں کہ دنیا چار دنوں کی ہے۔"

"شنکر! میں دھارمک (مذہبی) باتیں نہیں کر رہا ہوں۔ آبزرویٹری کی ان مشینوں کی زبان بول رہا ہوں جو کبھی جھوٹ نہیں کہتیں۔ ہماری یہ دھرتی پورے ایک سو پچاس دنوں کے بعد تباہ ہو جائے گی۔"

"ایں؟ سچ؟ نہیں پتاجی! آپ کی اس بات کا کوئی یقین نہیں کرے گا۔"

"نہ کرے۔ تمام سائنسداں اور ماہرین فلکیات یقین کریں گے اور ہم یہی چاہیں گے کہ عام لوگ یقین نہ کریں بلکہ کسی کے کانوں تک یہ بات نہ پہنچے۔ تم میرے بیٹے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ چار ماہ ستائیس دنوں تک تم ہنستی کھیلتی زندگی کو گلے لگاتے رہو۔ میں نے تمہاری محبت سے مجبور ہو کر تمہیں یہ راز بتایا ہے۔ خبردار روپ وتی کو یہ بات ہرگز نہ بتانا۔"

"نہیں بتاؤں گا۔ مگر مجھے یقین دلانے کے لیے یہ تو بتائیے کہ یہ اچانک ہماری دنیا کو کیا ہو جائے گا؟"

"ایک پونچھ لگو تارہ ہماری دھرتی سے ٹکرانے والا ہے۔"

"کیا سچ مچ؟ کب؟"

"ایک پاکستانی نجومی کے حساب کے مطابق اٹھائیس دسمبر کو شام چھ بج کر بارہ منٹ پر وہ ستارہ ایک دل ہلا دینے والے دھماکے کے ساتھ ٹکرائے گا۔"

"ایسا تو نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے پڑھا ہے کہ ستارے گیس کا مجمع ہوتے ہیں۔ وہ ستارہ ٹکرائے گا تو ہماری زمین پر صرف دھواں ہی دھواں پھیلے گا۔ ہم گیس ماسک پہن لیں گے۔ مجھے یاد ہے۔ میں نے ایچ جی ویلز کی ایک کتاب "ان دی ڈیز آف دی کومٹ" (دمدار ستارے کے دور میں) پڑھی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جب ایک دمدار ستارہ زمین سے ٹکرایا تو اس میں سے ایسی نیند لانے والی گیس پھیلی کہ تمام لوگ بے خبر سو گئے۔ پھر جب ان کی آنکھ کھلی تو ان کے سامنے ایک رنگا رنگ دنیا تھی۔ پتہ چلا کہ وہ لوگ کئی صدیوں تک سوتے رہے۔ تب تک دنیا میں نئے رسم و رواج، نئی مشینری اور نیا سائنسی انقلاب آچکا تھا۔"

"بیٹے! وہ سب افسانوی باتیں ہیں۔ ۱۹ مئی ۱۶۶۴ء میں ماہرین فلکیات نے جوپیٹر (مشتری سیارہ) میں ایک سرخ دھبہ دیکھا۔ اس زمانہ میں وہ سرخ دھبہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر آج کے جدید سائنسی آلات کے ذریعہ پتہ چلا کہ سترھویں صدی میں ایک دمدار ستارہ جوپیٹر سے ٹکرایا تھا اور ایسی خطرناک تیز رفتاری سے ٹکرایا تھا کہ جوپیٹر کی سطح میں جا کر ہمیشہ کے لیے دھنس گیا۔"

"تو اس میں زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ وہ پونچھ لگو تارہ زمین کے کسی ایک حصے سے ٹکرا کر دھنسے گا اور کسی ایک ہی حصہ

کو تباہ کرے گا۔ باقی زمین کے حصوں کو نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"شنکر! اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ جوپیٹر ہماری زمین سے تیرہ سو گنا بڑا ہے جبکہ وہ ٹکرانے والا دُمدار ستارہ سات ہزار میل چوڑا اور تیس ہزار میل لمبا تھا۔ اگر ہماری زمین کی طرف اتنا ہی بڑا دُمدار ستارہ آرہا ہے تو اندازہ کرو کہ اس کے سامنے ہماری زمین کتنی ننھی سی ہے جیسے ہتھیلی کے نیچے مچھر آتا ہے۔ ویسے ہی ہم پس کر رہ جائیں گے اور یہ دھرتی ان گنت ٹکڑوں میں بکھر کر کاغذ کے پرزوں کی طرح اڑے گی۔"

"مائی گاڈ! پتاجی! آپ تو ڈرا رہے ہیں۔"

"میں بچوں کو ڈرا کر سلانے والی کہانی نہیں سنا رہا ہوں۔ یہ ایک ایسی خطرناک سچائی ہے جو ہمارے آگے آکر رہے گی۔ اس لیے تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ جو زندگی تمہاری مٹھی میں رہ گئی ہے۔ اسے صرف اپنی خوشیوں کے لیے خرچ کرو۔ فوراً شادی کر لو۔"

شنکر نے عقب نما آئینہ میں پیچھے آنے والی کار دیکھی۔ اس کار سے روپ وتی کے حسن کی چاندنی چھلک رہی تھی۔ یہ دنیا جو کالی طلسم کی۔۔۔ کوتیا ہے، اندر سبھا کی مستی ہے، تاج محل کا حسن ہے اور روپ وتی کی مدھ بھری جوانی ہے۔ یہ ایک پل میں نہیں مٹ سکتی۔ کسی مصور نے آج تک اپنے شاہکار کا منہ نہیں نوچا۔ یہ بھگوان اتنا کٹھور، سنگدل نہیں ہو سکتا کہ اپنی دھرتی کی سندرتا کو یونہی نوچ کر پھینک دے۔

شنکر کے دل نے یقین نہیں کیا۔ مگر دماغ نے تسلیم کر لیا کہ اس کے باپ کا تجربہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اس نے فارن منسٹر کی کوٹھی کے احاطہ میں پہنچ کر گاڑی روک دی۔ ہمت راؤ گاڑی سے اترا تو مسلح سپاہی الرٹ ہو گئے۔ سیکرٹری نے ڈرائنگ روم تک اس کی راہنمائی کی۔ وہاں آرام دہ صوفوں پر وزیرِ خارجہ اور چار بڑے ممالک کے سفیر نظر آئے۔ وہ گفتگو کے دوران بیئر، وسکی اور شیمپین وغیرہ سے شغل کر رہے تھے۔ وزیرِ خارجہ نے بڑے ممالک کے سفراء سے ہمت راؤ کا تعارف کرایا پھر اس سے کہا۔

"اگر آپ فون نہ کرتے تب بھی آپ کو یہاں آنے کی زحمت دی جاتی۔ کل صبح فرینکفرٹ میں ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہو رہا ہے۔ تمام ترقی یافتہ ممالک کے تجربہ کار اور عالمی شہرت یافتہ سائنسدان اور ماہرینِ فلکیات اس اجلاس میں شریک ہو رہے ہیں۔ بھارت کی طرف سے آپ جائیں گے۔ آپ کے لیے ایک ہوائی جہاز چارٹرڈ کیا گیا ہے۔ یہاں سے ٹھیک ایک بجے رات روانگی ہوگی۔"

ہمت راؤ نے اطمینان کی سانس لے کر پوچھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام ممالک کی آبزرویٹری میں وہ دُمدار ستارہ دیکھا گیا ہے۔"

"جی ہاں اسی سلسلہ میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔"

"لیکن اس اجلاس سے پہلے ہمیں ایک اہم قدم اٹھانا ہوگا۔ آپ ذرا یہ پاکستانی اخبار پڑھیں۔"

اس نے اپنے فائیل سے وہ اخبار نکال کر ان کے آگے رکھ دیا۔ وہ لوگ باری باری اخبار کے اس حصّہ کو توجہ سے پڑھنے لگے جہاں عالمی شہرت یافتہ نجومی خورشید بلگرامی کی پیشن گوئی شائع ہوئی تھی۔ ایک سفیر نے کہا۔

"تعجب ہے۔ ماہرینِ فلکیات اور سائنسی آلات سے پہلے ہی نجومی کا دماغ بولتا ہے۔ اس شخص نے ہم سے ایک دن پہلے اپنے علم کی آنکھ سے دُمدار ستارے کو دیکھ لیا۔"

ہمت راؤ نے کہا۔ "میں یہ کہنے آیا ہوں کہ کل صبح شائع ہونے والے تمام پاکستانی اخبارات پر سنسر کا پہرہ لگنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ پروفیسر خورشید بلگرامی کا مزید کوئی بیان شائع ہو جائے۔"

ایک سفیر نے کہا۔ "اس طرح پاکستانی حکومت کو یہ بتانا پڑے گا کہ کسی خطرے کے پیشِ نظر ایسا کر رہے ہیں اور ابھی ہم یہ راز صرف چند ممالک تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔"

"مگر پاکستانی حکومت پر اور وہاں کے عوام پر یہ راز کھل جائے گا۔ اس نجومی کی زبان بند نہیں رہے گی۔"

سب اپنے اپنے جام میں ڈوب کر سوچنے لگے۔ ایک نے کہا۔

"اس کی زبان بند کرنی ہوگی۔ ہم ابھی اپنی اپنی حکومتوں سے رابطہ قائم کریں گے اور مطالبہ کریں گے کہ اجلاس میں ماہر نجومی پروفیسر خورشید بلگرامی کو بھی شریک ہونے کی دعوت دیجائے۔"

دوسرے نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

"ہاں اچھا آئیڈیا ہے۔ اس طرح جتنے دنوں وہ اجلاس میں مصروف رہے گا، اخبارات والوں کو اپنا بیان نہیں دے سکے گا۔"

"نہیں۔" ایک نے اعتراض کیا۔ "جب وہ واپس جائے گا تو اپنی حکومت کو اس خفیہ اجلاس کی غرض و غایت سے آگاہ کر دے گا۔"

"اسے واپس کون جانے دے گا۔"

سب چونک کر اس سفیر کو دیکھنے لگے۔ اس نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی ساری دنیا کے انسانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ آنے والی قیامت سے بے خبر رہیں تاکہ قانون اور ڈسپلن برقرار رہے۔ اگر ہم سارے انسانوں کی بھلائی کے لیے ایک نجومی کو اغوا کر لیں اور اسے قیامت تک قید میں رکھیں تو یہ ظلم نہیں ہوگا۔"

"ہاں یہ ظلم نہیں ہوگا۔" سب متفق ہو گئے۔

ہمت راؤ نے اپنے آپ کو اندر سے ٹٹولا کہ وہ کسی جُرم میں شریک تو نہیں ہو رہا ہے؟ اس کے دل نے کہا۔ "نہیں میں خود کسی کو اغوا نہیں کرنے والا ہوں۔ جس کا گناہ اسی کے سر۔۔۔"

★

روپ وتی ایک بہت بڑے کنبے کی ان داتا تھی جب وہ اپنی شاندار کوٹھی میں داخل ہوتی تو سارے ہی رشتے دار خوشامدانہ انداز میں اس کا سواگت کرتے تھے۔ پورچ میں کار کا ہارن سنتے ہی اس کے بھیا اور بھابی دوڑتے ہوئے آتے۔ بھیا نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ وہ کار سے باہر آئی تو بھابی نے بلائیں لیں۔ کیونکہ بھابی کو اپنی بچی کی سالگرہ کے لیے شاپنگ اور اخراجات کی فہرست پیش کرنی تھی۔ مگر روپ وتی انہیں غصّہ سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

آگے کوٹھی کے بیرونی دروازے پر ماماجی دانت نکالے کھڑے تھے۔ انہیں ہر شام ولایتی وہسکی کی ایک بوتل راشن کے طور پر ملتی تھی۔ وہ اپنی بھانجی کی شان میں کوئی قصیدہ پڑھنا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے ہی بھانجی طنطناتی ہوئی ان کے سامنے سے گزر گئی۔

ڈرائنگ روم میں اس کے بہن اور بہنوئی سواگت کیلئے موجود تھے۔ بہن نے آگے بڑھ کر۔۔۔ مسکراتے ہوئے کہا۔

"ابھی تمہارے جیجاجی (بہنوئی) سے تمہاری ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں کہہ رہی تھی کہ تمہاری اداکاری اتنی ونڈرفل ہوتی ہے کہ تمہاری کوئی فلم گولڈن جوبلی۔۔۔"

روپ وتی اسے نظرانداز کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ بہنوئی پیچھے چلتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں تمہاری دیدی (بہن) سے کہہ رہا تھا کہ تم ملبوسات کی ملکہ ہو۔ کوئی سا بھی لباس ہو تمہارے بدن پر سات سُروں کی طرح سجتا ہے۔ دراصل فلم دیکھنے۔۔۔ والے تمہاری سُندرتا کے کارن بار بار آتیں۔۔۔"

بات پوری ہونے سے پہلے ہی خواب گاہ کا دروازہ اس کے منہ پر ایک دھماکے سے بند ہو گیا۔ روپ وتی دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد تیزی سے چلتی ہوئی اپنے قوم کے بیڈ پر آکر تھکے ہوئے انداز میں گر پڑی۔ اسے اپنے کسی منصوبہ میں ذرا سی ناکامی کی جھلک نظر آتی تو اسے غصّہ آنے لگتا تھا۔

اور اسے شنکر راؤ پر غصّہ آرہا تھا جس نے یہ ضد پکڑلی تھی کہ چوبیس گھنٹے کے اندر شادی ہو جانی چاہیئے۔ فلم دیکھنے والے لاکھوں کروڑوں جوان اور بوڑھے اسے کنواری ہیروئن سمجھ کر آہیں بھرتے
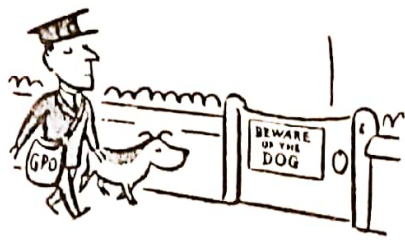
تھے۔ آہیں بھرنے سے کاروبار بڑھتا ہے مگر لاکھوں کی آہ لینے سے فلمیں فلاپ ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے وہ شنکر کو شادی کا سپنا دکھا سکتی تھی مگر شادی نہیں کر سکتی تھی۔

شنکر جیسے کتنے ہی کروڑ پتی اور ارب پتی جوان اور بوڑھے شادی کے لیے اس کی ڈیوڑھی پر ناک رگڑتے تھے۔ ان میں سے کتنے ہی ایسے تھے جن سے رومانس چل رہا تھا۔ شنکر سے اس نے شادی کے لیے اس لیے ہاں کر دی کہ اس دولت مند جوان کو فلم سازی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ روپ وتی پر عاشق ہو کر سرمایہ لگانا چاہتا تھا۔ بات یہ طے ہوئی تھی کہ فلم بنانے کی تمام ذمہ داری روپ وتی پر ہو گی۔ شنکر کا سرمایہ روپ وتی کے ہاتھوں سے فلم میں لگتا رہے گا۔ اور فلم کا بزنس بھی روپ وتی کے نام سے اور اس کے دستخطوں سے ہوگا۔ ایسا احمق عاشق بڑی مدتوں بعد دام میں آتا ہے۔

اس کی حوصلہ افزائی کے لیے روپ وتی نے کہہ دیا تھا کہ جب وہ اس پر اتنا بھروسہ کر رہا ہے تو پھر فلم مکمل ہوتے ہی اس سے شادی کرے گی۔ مگر اب وہ احمق کچھ چالاک بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ سرمایہ لگنے سے پہلے ہی ضد کر رہا تھا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر شادی ہو جانی چاہیے۔ وہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھی۔

"پاجی کمیں کا! شادی کی ایسی جلدی کر رہا ہے جیسے قیامت آنے والی ہو۔ اونہہ...."

اسے رہ رہ کر شنکر پر غصہ آ رہا تھا۔ فلم کا بجٹ ایک کروڑ بیس لاکھ روپے کا تھا۔ شنکر نے اب تک بارہ لاکھ روپے دیے تھے فلم چونکہ امریکہ، انگلینڈ، فرانس، اٹلی اور ہندوستان میں تیار ہونی تھی اس لیے بیرونی ممالک جا کر لوکیشن دیکھنے اور شاپنگ کرنے میں نو لاکھ خرچ ہو چکے تھے۔ اب بجٹ کے مطابق روپ وتی کے ہاتھوں میں ایک کروڑ آٹھ لاکھ روپے آنے والے تھے مگر وہ چوبیس گھنٹے کے اندر شادی کرنے والی شرط ہے

اس بار اس نے غصہ کو پی لیا۔ ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچنے لگی۔ "اگر میں ذہانت سے کام لوں تو شادی ٹل سکتی ہے۔ ابھی میں شنکر سے کہوں گی کہ اس کے پتا جی دو دن کے لیے دیس سے باہر جا رہے ہیں۔ اسلیے چوبیس گھنٹے میں شادی نہیں ہو سکتی۔ دو دن بعد میں اپنے بھیا کو بیمار بنا دوں گی۔ وہ بیماری کے بہانے پندرہ بیس دن کھینچ لے جائیں گے۔ پھر ناگپور سے ایک ٹیلیگرام آئے گا کہ میری سگی موسی کا دیہانت (انتقال) ہو گیا ہے۔ ایک ماہ تک کوئی خوشی نہیں منائی جائے گی۔ پھر میں اپنی زیر تکمیل فلموں کے پروڈیوسروں کو لمبی تاریخیں دوں گی۔ تین چار ماہ تک سب ہی پروڈیوسر شنکر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں گے کہ ابھی وہ شادی کرے گا تو کتنے ہی فلم ساز دس کروڑ روپے کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

وہ سوچتی رہی اور مسکراتی رہی۔ یہ چار پانچ ماہ شنکر سے ایک کروڑ آٹھ لاکھ روپے کھینچنے کے لیے کافی تھے۔ اس نے فوراً ہی ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر شنکر سے رابطہ قائم کیا۔

"ہیلو شنکر! کیا کر رہے ہو؟"

"ابھی تو تمہیں یاد کر رہا ہوں۔ آدھ گھنٹے بعد پتا جی کو ائیرپورٹ چھوڑنے جاؤں گا۔"

"میں بھی انہیں سی آف کرنے جاؤں گی۔ بولو تو آ جاؤں؟"

"او مائی سویٹ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ہو سکے تو ٹیلیفون کے راستے آواز کی رفتار سے آ جاؤ۔"

روپ وتی نے کھنکتی ہوئی ہنسی کے ساتھ ریسیور رکھ دیا۔ شنکر نے سمجھا کہ اس کے مزاح پر ہنس رہی ہے جبکہ وہ نئے سرے سے چھیننے کے لیے ہنس رہی تھی۔ اس نے وارڈروب کے پاس جا کر اسے کھولا۔ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ وہ کسی ایسے لباس کا انتخاب کرنے لگی جو آدھی رات کے بعد بھی دیکھنے والوں کی نیند اڑا دے۔ اکثر حسین عورتیں لباس کچھ اس انداز میں پہننے کی کوشش کرتی ہیں کہ لباس کا اپنا حسن الگ ہو اور بدن الگ اپنا مزاج دکھائے۔ تب دیکھنے والوں کا مزاج پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

جب وہ ہمت راؤ کی کوٹھی میں پہنچی تو اس کے بدن پر کالی رنگ کا ٹیلیپر شرٹ تھا۔ بغیر آستین کے شرٹ میں اس کی گوری گداز بانہیں چمک رہی تھیں۔ گردن سے اوپر چہرے کی چاندنی کھل رہی تھی۔ لباس کا گہرا رنگ رات کی سیاہی میں گم ہو رہا تھا صرف چہرہ اور دو بانہیں اس طرح نظر آتی تھیں جیسے تاریکی سے سر نکال کر اور ہاتھ اٹھا کر کہہ رہی ہو "میں صرف اتنی نہیں ہوں پاس آ کر باقی روپ وتی کو ڈھونڈو۔"

شنکر نے کہا "جی چاہتا ہے، تمہارے لباس کے اندھیرے میں میں بھی آدھا چھپ جاؤں مگر افسوس کہ شادی سے پہلے تم چھپنے نہیں دو گی۔ اچھا تو بتاؤ۔ تم نے شادی کے لیے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

روپ وتی نے بڑے ہی رومانٹک انداز میں اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"شنکر! میں پہلے بہت ضدی تھی۔ پتہ نہیں تم نے مجھے کیا کر دیا ہے۔ تمہارے آگے ضد ہار جانا اچھا لگتا ہے۔"

"دہ مارا۔" اس نے گوری بانہوں کو مضبوطی سے تھام کر پوچھا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ کل تم میری دھرم پتنی بن رہی ہو۔"

"میں تو ابھی بن جاؤں۔ اپنے پتا جی سے کہو کہ لگن منڈپ میں ہمارے سات پھیرے لگنے تک وہ رک جائیں۔ ہمارا بیاہ

ضروری ہے۔ وہ کل صبح بھی جا سکتے ہیں۔"

"آں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پتا جی ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ انہیں جانے دو۔ ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔"

"میرے گھر والے نہیں مانیں گے۔ بیاہ دھرم کے مطابق ہونا چاہیے۔ میں فلموں میں کتنی ہی بار شادیاں کر چکی ہوں۔ میرے دل میں سچ مچ دلہن بننے کے ارمان ہیں۔ اب یہ ارمان پورے نہ ہوئے تو کیا تم دوسری بار مجھے دلہن بنانے کے لیے شادی کرو گے؟"

اتنے میں ہمت راؤ اپنے ہاتھ میں اٹیچی اٹھائے باہر برآمدے میں آیا۔ "چلو بیٹے! دیر ہو رہی ہے۔"

اس نے باپ کے ہاتھ سے اٹیچی لے کر کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"رُوپا! تم پتا جی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھو۔ میں ڈرائیو کرتا ہوں۔"

ہمت راؤ نے کہا "نہیں شنکر! تم دونوں کو ایک ساتھ آگے بیٹھنا چاہیے۔"

"ائیرپورٹ سے واپسی میں میں رُوپا ہی کے ساتھ بیٹھ کر آؤں گا۔ آپ ابھی تو اکیلے نہ رہیں۔"

اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ ہمت راؤ جب روپ وتی کے برابر بیٹھا تو اس کی سانسیں خوشبو خوشبو ہو گئیں۔ اس سمے اسے اپنی سورگ باسی بیوی پشپا رانی یاد آ گئی۔ کیا جوانی کے دن تھے۔ عمر کی ہر سانس خوشبو سے معطر ہوتی تھی۔ پشپا رانی اسی طرح اس کے ساتھ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھتی تھی۔ مگر وہ اس طرح بغیر آستین کا لباس نہیں پہنتی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے روپ وتی کے چکنے سڈول بازو کو دیکھا۔ پھر جلدی سے دوسری طرف منہ پھیر کر سوچنے لگا۔ "یہ مسلمان ٹھیک کہتے ہیں کہ قیامت کے قریب عورتیں اتنی بے حیا ہو جائیں گی کہ لباس کو بوجھ سمجھنے لگیں گی اور اسے کم سے کم کرتی جائیں گی۔ ٹھیک ہی قیامت آ رہی ہے۔"

قیامت جو آنے والی تھی اور قیامت جو برابر آ کر بیٹھ گئی تھی پتہ نہیں کس قیامت کے خوف سے ہمت راؤ کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسی وقت شنکر نے پوچھا۔

"آپ شادی کے لیے کیا کہتے ہیں؟"

ہمت راؤ نے دل کی دھڑکنوں میں بہتے ہوئے کہا۔

"واپس آ کر ضرور کروں گا۔" پھر اس نے ایک دم سے چونک کر پوچھا "آں۔ تم نے کس کے لیے پوچھا۔ او سمجھا تم اپنی شادی کے لیے کہہ رہے ہو۔ ہاں ضرور کرو مگر جلدی کرو۔"

شنکر نے قہقہہ لگاتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

"روپ وتی! تمہیں ایک خوشخبری سناؤں کہ پتا جی بھی بہت جلدی شادی کرنے والے ہیں۔"

روپ وتی نے مسکرا کر ہمت راؤ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"واقعی آپ بوڑھے تو نہیں لگتے۔ اس سوٹ میں کتنے ینگ اور اسمارٹ لگ رہے ہیں۔ آپ کی عمر کیا ہو گی؟"

ہمت راؤ نے بارہا اس سوال کا جواب اپنی خیالی محبوبہ کو دیا تھا۔ کیونکہ جب بھی وہ اپنی شادی کے لیے سوچتا تھا تو ہونے والی بیوی اس کے خیالوں میں آ کر عمر پوچھتی تھی۔

شنکر نے کہا "پتا جی پورے اڑتالیس برس کے ہیں۔ ان کی صحت دیکھو میری طرح ہے۔ قد میں مجھ سے اونچے ہیں۔ اس عمر میں آدمی بوڑھا نہیں ہوتا۔ پتا جی نے خواہ مخواہ دن رات مصروف رہ کر اپنے بال سفید کر لیے ہیں۔"

ہمت راؤ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھئی میری بات نہ کرو۔ اپنی شادی کا فیصلہ سناؤ۔"

"یہ رُوپا شادی کی بات ٹال رہی ہے۔"

"جھوٹا الزام نہ دو شنکر! میرے گھر والے اور تمہارے گھر والے یعنی جب تک ہمارے بڑے موجود نہیں ہوں گے یہ شادی ایک مذاق معلوم ہو گی۔ دو دن کی تو بات ہے۔ تمہارے پتا جی واپس آئیں گے تو اپنی ضد پوری کر لینا۔"

وہ آپس میں بحث کرتے ہوئے ائیرپورٹ پہنچ گئے۔ ہمت راؤ نے وی آئی پی روم میں ان سے رخصت ہوتے ہوتے فیصلہ سنایا۔

"روپ وتی ٹھیک کہتی ہے۔ اس کے گھر والے چاہیں گے کہ بیاہ کے وقت لڑکے کا باپ موجود رہے۔ کوئی بات نہیں۔ میرے واپس آتے ہی یہ شبھ ویواہ ہو جائے گا۔"

شنکر کا موڈ خراب ہو گیا۔ واپسی میں اس نے کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

یہ کہتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

روپ وتی نے بھی ایک جھٹکے سے جواب دیا۔

"سچائی بہت کڑوی ہوتی ہے اگر میں تمہارے بارے میں کچھ کہوں گی تو فوراً برا مان جاؤ گے۔"

"ضرور کہو، میں سننا چاہتا ہوں کہ وہ سچائی کیا ہے؟"

"دیکھو تم فلم میں ایک کروڑ بیس لاکھ کا سرمایہ لگا رہے ہو اس سے پہلے چاہتے ہو کہ تم مجھے بیوی کا نام دے کر مجھے اپنا سرمایہ بنا لو۔ ایسا نہیں کرو گے تو میں ایک ایکٹریس ہوں۔ تمہاری اتنی بڑی رقم ہضم کر لوں گی۔"
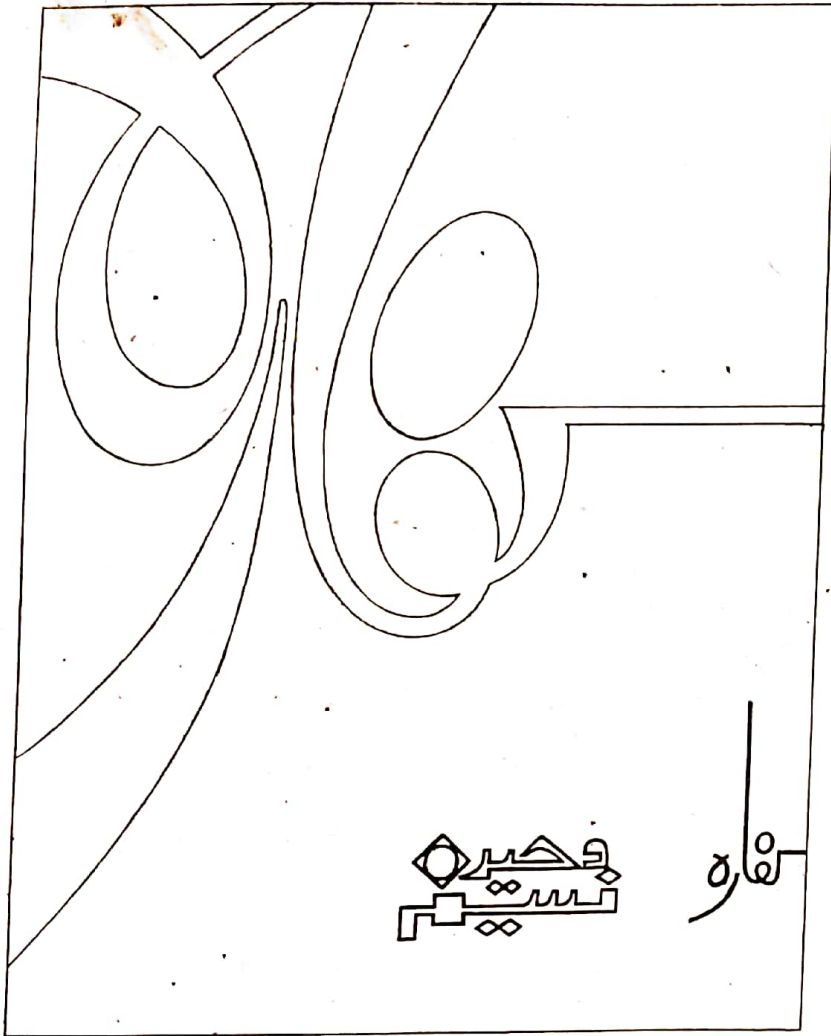
"چھی چھی رُوپا! تم نے کیسی نیچ بات کہی ہے۔ سچی محبت کرنے

والے کبھی پیسوں کا منہ نہیں دیکھتے۔ میں ابھی گھر چل کر تمہیں فلمی بجٹ کی پوری رقم کا چیک لکھ کر دے دوں گا۔"

روپ وتی نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جب یہ بات ہے کہ تم مجھ پر اندھا اعتماد کرتے ہو۔ مجھے اپنی دولت سے زیادہ چاہتے ہو تو پھر شادی کی جلدی کیوں کر رہے ہو۔ کیا شادی نہیں کرو گے تو میں بھاگ جاؤں گی؟"

"یہ بات نہیں ہے روپا! میں جلد سے جلد ہنی مون مناتے ہوئے پوری دنیا گھومنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر چلو، میں تمام شوٹنگ کینسل کر دیتی ہوں۔ ہم شادی کے بغیر بھی....."

"اوہ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ پتاجی نہیں مانیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ مرنے سے پہلے....."

"تم کہتے کہتے رک کیوں گئے؟ آگے کہو کیا تمہارے پتاجی مرنے والے ہیں؟"

"ہے بھگوان! میں کیا بتاؤں؟ روپا! ایک بہت بڑی مجبوری ہے بلکہ راز ہے۔ تم پوچھے بغیر شادی کر لو تو اچھا ہے۔"

"ارے واہ! اچھا راز ہے جسے بیوی بنانا چاہتے ہو اس سے چھپا رہے ہو۔ جس عورت پر اتنا بھروسہ نہ ہو کہ وہ اپنے پتی (شوہر) کا راز اپنے سینے میں چھپا کر رکھ سکتی ہے تو اس سے شادی کیوں کر رہے ہو؟"

وہ ناراض ہو کر دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ سشنکر تھوڑی دیر تک تذبذب میں رہا۔ پھر اس نے ہار مان کر کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ جب ہم ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے ہیں اور پتی پتنی بننے والے ہیں تو مجھے تم سے کچھ نہیں چھپانا چاہیئے۔ مگر وچن دو کہ یہ راز اپنے سائے کو بھی نہیں بتاؤ گی۔"

روپ وتی کے اندر کھلبلی سی مچ گئی۔ عورت کے آگے کوئی بات چھیڑو تو وہ اس بات کی جڑ تک پہنچ کر رہتی ہے۔

"میں وچن دیتی ہوں۔ تمہاری قسم اور اپنی قسم کھاتی ہوں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ جلدی بتاؤ۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"یہ جو ہماری دھرتی ہے نا۔ یہ چار ماہ ستائیس دن کے بعد بالکل تباہ ہو جائے گی۔ ہم سب مر جائیں گے۔ یہاں ایک بھی چیز باقی نہیں بچے گی۔"

وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔

"کیا یہ کسی جوتشی نے کہا ہے؟"

"ویسے تو ایک مسلمان جوتشی نے کہا ہے مگر دنیا کے دوسرے ماہرین فلکیات بھی اپنی اپنی آبزرویٹری سے اس دُمدار ستارے کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ ستارہ اتنی تیزی سے آ کر ہماری زمین سے ٹکرائے گا کہ اس کے بعد ہماری زمین کا ایک کنکر پتھر بھی نظر نہیں آئے گا۔"

روپ وتی نے رونے والا منہ بنا لیا۔

"نہیں جھوٹ بولتے ہو۔ مجھے اس طرح ڈرا کر جلدی شادی کرنا چاہتے ہو۔"

"میں ڈرانا نہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ بھگوان نے امبر کے ماتھے (آسمان کی پیشانی) پر ایک ہی دن ہم سب کی موت لکھ دی ہے، جبکہ ہم سب کو مرنا ہی ہے تو پھر روتے اور ڈرتے ہوئے بھی مرنا ہے اور ہنستے کھیلتے ہوئے بھی مرنا ہے۔ پھر کیوں نہ ہم ایک دوسرے کی آغوش میں ایک جان ہو کر مریں۔"

"کیسی بھیانک باتیں کر رہے ہو۔ کیا تمہیں ذرا بھی ڈر نہیں لگ رہا ہے؟"

"تمہاری محبت کی چھاؤں نہ ملے تو شاید ڈر لگے۔ کیا بھول گئیں۔ تم نے خود "لیلیٰ مجنوں" میں مجنوں کے سینے سے لگ کر اس کے بازوؤں میں چھپ کر جان دی تھی۔ سچی محبت اسی کو کہتے ہیں۔"

"ارے وہ تو فلمی موت تھی۔ کوئی عورت ذرا بھی عقل رکھتی ہو تو وہ مجنوں جیسے پاگل آدمی کے پاس جا کر مرنے کی بجائے اپنی جان بچانے کی فکر کرے گی۔"

"تعجب ہے۔ تم موت کو سامنے دیکھ کر محبت کی توہین کر رہی ہو۔"

"تم نے کیا محبت محبت لگا رکھی ہے؟ کیا تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو؟"

"ضرور کرتا ہوں، آزما کر دیکھ لو۔"

"تو پھر مجھے اس دُمدار ستارے سے بچاؤ۔ یہ تم مردوں نے محبت کی جتنی کہانیاں بنائی ہیں، اس میں عورت کو مرنا ہی سکھایا ہے۔ کبھی عورت کو محبت میں جینا بھی تو سکھاؤ۔ کبھی یہ بھی تو کہو کہ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ کہو نا؟"

"کیسے کہوں؟ بچنے کی کوئی جگہ ہوتی تو میں ابھی وہاں تمہیں لیجا کر چھپا دیتا۔"

"جگہ کیسے نہ ہوگی۔ یہ دھرتی اتنی وشال (وسیع و عریض) ہے ان سمندروں کا کوئی اور چھور نہیں ہے۔ کیا دُمدار ستارہ سب ہی جگہ جا کر ٹکرائے گا؟"

"روپا! وہ خطرناک ستارہ اتنا بڑا ہے، اتنا بڑا ہے کہ یاد نہیں آ رہا ہے کہ پتاجی نے کتنا بڑا بتایا تھا۔ ہاں وہ کہتے ہیں کہ اس منحوس ستارے کے سامنے ہماری یہ پوری دھرتی اور ساگر مچھر کی طرح ہیں اس سے اندازہ کر سکتی ہو کہ چھپنے کی کہیں جگہ نہیں ہے۔ ہم سب کا ملیدہ بن جائے گا، اور وہ ملیدہ بھی شاید دُمدار ستارے کا ایک حصہ

وحیدہ نسیم

ں کر رہ جائے۔"

مارے دہشت کے روپ وتی کی گردن "نہیں نہیں" کے انداز میں ہلتی رہی۔ پھر اس نے باقاعدہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"نہیں نہیں میں نہیں مروں گی۔ گاڑی روکو۔ میں کہیں بھاگ جاؤں گی۔ گاڑی روکو نا...."

وہ اسے جھنجھوڑنے لگی۔ اس نے گاڑی نہیں روکی۔ اسے سمجھانے لگا۔

"روپا! تم سمجھدار ہو۔ عقل سے کام لو۔ کار سے اتر کر بھاگو گی تو دوسروں کو بھی تمہارے پاگل پن کا راز معلوم ہو جائے گا۔ پھر تمہاری طرح ہر راستہ اور ہر گلی میں پاگل ہی پاگل نظر آئیں گے۔ میری جان دھیرج سے کام لو۔ کار سے نکل کر زمین پر بھاگو گی۔ زمین سے نکل کر سمندر میں ڈوب جاؤ گی۔"

اس نے کار سے نکل کر بھاگنے کی دوبارہ ضد نہیں کی، مگر روتی رہی۔ آنکھوں کا کاجل، آئی شیڈ اور چہرے کا میک اپ آنسوؤں سے پھیل رہا تھا۔ حسین مکھڑے پر کہیں سیاہی آتی کہیں سرخ دھبے تھے۔ کہیں آئی شیڈ کے سبز چھینٹے پڑ رہے تھے۔ ایک عجیب سی وحشت اور ویرانی تھی۔ ابھی دمدار ستارہ نہیں آیا تھا صرف اس کے چہرے پر اپنی خیالی دُم ذرا سی جھاڑ کر چلا گیا تھا تو وہ حسین چہرہ یوں سپاٹ، ویران اور کھنڈر بن گیا تھا۔ جب وہ آسمانی بلا زمین سے ٹکرائے گی تو کیا منظر ہوگا؟ اکثر حالات میں ایک انسان کا اجاڑ چہرہ دیکھ کر ساری دھرتی کا بگڑا ہوا چہرہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

شنکر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے آنسو کس طرح پونچھے اس نے بس ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی۔ "میں نہیں مروں گی۔ میں زندہ رہوں گی۔ اگر میں ایک ہوائی جہاز چارٹرڈ کر کے دھرتی سے اڑ جاؤں تو دھرتی اور آکاش کے بیچ محفوظ رہ سکتی ہوں۔"

شنکر اب اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا تاکہ کسی طرح اس کی تسلی ہو جائے۔ اس نے کہا۔

"ہاں رُوپا! جب وہ ستارہ دھرتی سے ٹکرانے آئے گا تو ہم ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اڑ جائیں گے۔ اسی جہاز میں ہم ہنی مون منائیں گے اور نیچے دھرتی تباہ ہوتی رہے گی۔ جب ہم یہاں واپس آئیں گے تو تمام زمینی زندگیاں ختم ہو چکی ہوں گی۔ دنیا ایک سرے سے دوسرے سرے تک صرف ہماری ہوگی۔ پھر ہم آدم حوا کی طرح نئے سرے سے اس دنیا کو آباد کریں گے۔"

وہ سوچنے لگی۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ نہیں، وہ منحوس ستارہ تو آکاش ہی سے آئے گا۔ تو پھر آکاش اور دھرتی کے درمیان اڑنے والا جہاز کیسے محفوظ رہ سکتا ہے؟ وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔

"نہیں ہم آبدوز میں بیٹھ کر سمندر کی گہرائی میں چلے جائیں گے وہ ستارہ اتنی گہرائی تک نہیں پہنچے گا۔"

پھر اس نے خود ہی تردید کی "نہیں آبدوز چارٹرڈ نہیں کی جا سکتی۔ وہ صرف فوجی مقاصد کے لیے ریزرو رکھی جاتی ہے۔"

شنکر نے اچانک ہی اسے مطمئن کرنے کی تدبیر سوچ لی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"روپا! ہم زندہ رہیں گے۔ میں اتنی دیر سے یہ دیکھ رہا تھا کہ تم جان بچانے کی کتنی تدبیریں سوچ سکتی ہو۔ مگر تمہاری سوچ تھک گئی۔ اب تم پھر رونا شروع کر دو گی۔ اس لیے اب میں تمہیں دوسرا راز بتا دوں۔"

وہ ایک دم سے گلے کا ہار بن گئی۔ ایسی صورت میں شنکر کو گاڑی روکنی پڑی۔ کیونکہ وہ ایک وقت میں ایک ہی کو سنبھال سکتا تھا۔ اسٹیرنگ کو یا روپ وتی کو۔ لہٰذا اس نے روپ کو اپنی آغوش میں سنبھال کر کہا۔

"جانتی ہو پتاجی کہاں گئے ہیں؟ وہ یہی اُپائے کرنے گئے ہیں کہ ہماری جان کیسے بچ سکتی ہے۔"

"سچ؟ تم بہلا تو نہیں رہے ہو؟"

"وہ مجھے یا تمہیں بہلانے کے لیے چارٹرڈ ہوائی جہاز میں تو نہیں جائیں گے۔ دنیا کے بہت بڑے بڑے دماغ فرینکفرٹ میں جمع ہو رہے ہیں۔ ان میں ایک میرے پتاجی بھی ہیں۔ وہاں سب لوگ سر جوڑ کر سوچیں گے کہ اپنی اس دنیا کو کس طرح بچا سکتے ہیں۔"

"اگر دنیا کو نہ بچا سکے تو؟"

"تو خود کو بچائیں گے۔"

"شنکر! تمہیں اپنے پتاجی سے کہنا چاہیے تھا کہ دنیا کو بھاڑ میں جھونکیں۔ پہلے ہمیں بچانے کی چنتا (فکر) کریں۔"

"وہ یہی کر رہے ہیں۔ دیکھو روپا! پتاجی اپنے دیس میں اور دیس کے باہر بہت مشہور ہیں۔ وہ اخبارات میں یہی بیانات دیں گے کہ دیس کو بچانے کی فکر کر رہے ہیں۔ ہر انسان اپنی فطرت سے مجبور ہو کر پہلے اپنی جان کی حفاظت کرتا ہے۔ پھر اس کے لیے جو رشتہ سب سے عزیز ہوتا ہے اور جس سے زیادہ محبت ہوتی ہے اسے بچانے کی فکر کرتا ہے۔ پھر پورے خاندان کے لیے سوچتا ہے۔ اتنے بڑے دیس کے کروڑوں لوگوں کو بچانے کا سوال آخر میں پیدا ہوتا ہے۔"

"اچھا سمجھ گئی۔ پہلے تمہارے پتاجی اپنی فکر کریں گے۔"

"نہیں پہلے مجھے بچائیں گے۔ وہ اپنی جان سے زیادہ مجھے چاہتے ہیں، اور میں اپنی جان سے زیادہ تمہیں چاہتا ہوں۔"

"تو پھر تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔"

وہ پھر گلے لگ گئی۔ شنکر بہت خوش تھا کہ وہ بار بار گلے لگ رہی تھی، ورنہ پہلے تو شرمانے لجانے کے بہانے اس سے کتراتی رہتی تھی۔ قسمیں کھاتی تھی کہ فلموں کو چھوڑ کر حقیقی زندگی میں وہ آج تک کسی مرد کے قریب نہیں گئی۔ اس لیے شنکر سے بھی کہتی تھی "میں کنواری ہوں۔ فلموں کے گندے ماحول میں کنول کی طرح ہوں میں وہ عورت ہوں جو جان دے دیتی ہے پر عزت نہیں دیتی۔"

اور اب وہ جان بچانے کے لیے اس کی آغوش میں چلی گئی تھی۔ شنکر نے سوچا "میں نے اچھی بات بنائی ہے۔ اس طرح یہ فائدہ ہوا کہ یہ مجھے چھ ماہ تک دوڑانے کے بعد آج گلے لگ گئی اب یہ جان کی سلامتی کے لیے دو دن بعد شادی بھی کرے گی...."

گلے لگتے وقت یوں ہوتا ہے کہ ایک کا منہ اگر مشرق کی طرف ہوتا ہے تو دوسرے کا منہ مغرب کی طرف ہو جاتا ہے۔ شنکر مشرقی دلہن کے سپنے دیکھ رہا تھا۔ روپ وتی مغرب کی طرف جانے والے ہمت راؤ کے بارے میں سوچ رہی تھی "کیا وہ بوڑھا مجھے قیامت سے بچائے گا؟ ہو سکتا ہے کہ یہ جوان جھوٹ بول کر مجھے بیاہ کے بندھن میں باندھنا چاہتا ہو۔ سچ کیا ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لیے مجھے ہمت راؤ کا انتظار کرنا ہوگا۔ وہ بوڑھا بہت اہم ہے۔"

★

ہمت راؤ نے طیارے میں سفر کے دوران نیند پوری کر لی صبح سات بجے وہ فرینکفرٹ پہنچا تو اسے سرکاری طور پر اطلاع دی گئی کہ سفر ابھی جاری رہے گا۔ اسے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے سوئٹزرلینڈ جانا ہوگا۔ وہ ایئرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں آکر بیٹھ گیا وہاں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے۔ امریکا اور روس کے سائنسدان جرمنی اور جاپان کے انجینئر، گرین وچ کے ماہرینِ فلکیات اور دو عالمی شہرت یافتہ نجومی تھے۔ ایک امریکا کی بزرگ خاتون مادام فلیچر تھی۔ جس کی پیشگوئی پتھر کی لکیر سمجھی جاتی تھی۔ دوسرا نجومی پتھر کی لکیر کھینچنے والا تھا۔ دینیات پر وفیسر خورشید بلگرامی کے نام سے جانا جاتا تھا۔

ہمت راؤ اسے نہیں پہچانتا تھا لیکن پروفیسر کے سر پر جناح کیپ دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ پاکستان سے آیا ہے اور ہو نہ ہو وہی خورشید بلگرامی ہے۔ جب وہ اس کے قریب ایک صوفے پر آکر بیٹھا تو اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ مادام فلیچر کہہ رہی تھی۔

"مسٹر خورشید! ہمارا حساب بالکل درست نکلا۔ میں نے بھی اخبارات میں بیان دیا تھا مگر وہ سنسر کر دیا گیا۔"

خورشید بلگرامی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"اگر ہم اپنے علم سے کہتے ہیں کہ ایسا ہونے والا ہے تو اس کا ہونا یقینی ہوتا ہے۔ مگر وہ قادرِ مطلق ہے انہونی کو ہونی اور ہونی کو انہونی بنا دیتا ہے۔ وہ ہماری پیشگوئی کے مفہوم کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔"

"نہیں مسٹر خورشید!" مادام فلیچر نے کہا "ہماری پیشگوئی نہیں بدلے گی۔ اب سائنسی آلات بھی تصدیق کر رہے ہیں کہ وہ کومٹ (دمدار ستارہ) ہماری زمین کی طرف آرہا ہے۔ اس کا راستہ نہیں بدلے گا۔ اگر آپ کے حساب میں تبدیلی آئی ہو تو مجھے بتائیں۔"

"میرے حساب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں تو اپنے ایمان اور عقیدے کے تحت کہہ رہا ہوں کہ خداوند کریم چاہے تو قیامت کی وہ گھڑی ٹل سکتی ہے۔"

مادام فلیچر نے کہا "آپ بُرا نہ مانیں یہ محض دل کو بہلانے والی باتیں ہیں کہ خدا ایسا کر سکتا ہے۔ علم ریاضی اٹل ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ کششِ ثقل کا قانون اٹل ہے کہ کسی بھی چیز کو لاکھ آسمان کی طرف اچھالو، وہ زمین ہی کی طرف واپس آئے گی۔ علم رمل کے ہندسوں اور حساب دانوں نے دمدار ستارے کو زمین کی راہ دکھا دی ہے۔ قدرتی طور پر ایسا ہو رہا ہے۔ لہٰذا وہ ستارہ زمین سے ضرور ٹکرائے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بچاؤ کا کوئی راستہ نہ دیکھ کر آپ مسجد میں جائیں گے اور میں چرچ کی راہ لوں گی۔"

ہمت راؤ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"مادام! آپ بڑی حقیقت پسندانہ باتیں کر رہی ہیں۔ میں آپ سے متفق ہوں۔ آپ ابھی اپنے کسی بیان کے سنسر ہونے کی بات کر رہی تھیں۔ اگر وہ دمدار ستارے کے متعلق ہے تو میں کہہ دوں کہ سنسر جائز ہے۔ ابھی عام لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں ہونی چاہیے ورنہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خوف و ہراس پھیل جائے گا۔ لوگ اپنی سلامتی کے لیے پاگلوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا تو وہ ایک دوسرے کو لوٹنا اور قتل کرنا شروع کر دیں گے یا پھر مارے دہشت کے خودکشی کرنے لگیں گے۔ میں نے خورشید صاحب کا بیان پڑھا ہے اسے شائع نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

خورشید بلگرامی نے کہا۔

"وہ تو شائع ہو گیا۔ آپ بتائیں کون سی قیامت آگئی کتنے لوگ پاگل ہو گئے۔"

"آں ہاں" ہمت راؤ اس سوال سے چکرا گیا۔

"دیکھیے شریمان! اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ آسمانی کتابوں کی پیش گوئی سے انسان دہشت زدہ نہیں ہوتے تو پھر ایسے انسانوں پر قیامت برپا ہونی چاہیے جو مجھ جیسے حقیر انسان کی پیش گوئی سے دہشت اور جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنے بیان میں یہ نہیں۔ ۔ ۔ کہا کہ سائنسی آلات میری پیشگوئی کی تصدیق کر رہے

ہیں اور نہ ہی یہ کبھی کہوں گا۔ جب میں کسی کے ہاتھ پر موت کی لکیر دیکھ لیتا ہوں تو اسے کبھی یہ نہیں بتاتا کہ تمہاری موت قریب ہے۔ اسے دوسرے انداز میں سمجھاتا ہوں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو اور اپنے دشمنوں کو معاف کر دو۔ میرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ غفلت میں کچھ روز سکون سے اس طرح جیئے کہ ایمان ساتھ رہے۔

میں نے اخبارات میں دُمدار ستارے کے متعلق جو کچھ کہا ہے، اسے پڑھ کر لوگ نہ تو دہشت اور جنون میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ ہوں گے۔ مگر وہ لوگ جو میری پیشگوئی سے متاثر ہوں گے، اور عبرت حاصل کریں گے وہ کم از کم چار ماہ چھبیس دن تک توبہ کی راہ پر چلتے رہیں گے۔"

اتنے میں وی آئی پی لاؤنج کا باوردی ملازم ویری امپورٹنٹ پرسنس کے لیے ناشتہ کی ٹرالی لے آیا۔ سب لوگ ایک ایک پلیٹ میں اپنی پسند کی چیزیں لے کر کھانے لگے۔ ہمت راؤ اور مادام فلیچر نے خورشید بلگرامی کو بھی کھانے میں شریک ہونے کے لیے کہا۔ اس نے بتایا کہ رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا ہے اور وہ بچپن ہی سے روزے نماز کا پابند ہے۔ اس لیے وہ ان کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔

ہمت راؤ نے ناشتہ کے دوران اسے دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا کہ خورشید بلگرامی کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان ہوگی۔ اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ چہرے پر ہلکی ہلکی ملائم ریشم جیسی ڈاڑھی تھی۔ ڈاڑھی اور سر کے بال سنہرے تھے۔ آنکھوں پر جو سیاہ چشمہ تھا اس کا فریم بھی سنہرا تھا۔ جب اس نے رومال سے سیاہ شیشوں کو صاف کرنے کے لیے چشمہ اتارا تو اس کی آنکھوں کی گہرائی اور نگاہوں کی مقناطیسی کشش کا پتہ چلا۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ہمت راؤ کو اوپر سے تو دیکھ رہا ہو مگر اس کے اندر سے اس کی جنم پتری بھی پڑھ رہا ہو۔

جب کافی کا دور چلنے لگا تو ایک ماہرِ فلکیات نے کہا۔

"مسٹر خورشید! ہم بھی آپ کی طرح ستاروں کی چال کو دیکھتے پڑھتے اور سمجھتے ہیں مگر ہمارا طریقۂ کار بالکل مختلف ہے۔ بہرحال ہم اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ وہ کومٹ بہرحال میں ہماری زمین سے ٹکرائے گا اور یہاں ایسی قیامت برپا ہوگی کہ اس کے بعد ہم اس تباہی و بربادی کا حساب کرنے کے لیے زندہ نہیں رہیں گے۔ اس سلسلہ میں میں آپ سے ایک سوال کروں گا کہ ہاتھ کی لکیریں کس حد تک سچ بولتی ہیں؟"

"جب تک اس ہاتھ والے کا ستارہ اپنا مزاج نہیں بدلتا یا دوسرے ستارے اس پر اثر انداز نہیں ہوتے اس وقت تک ہاتھ کی لکیریں، پتھر کی لکیریں ہوتی ہیں۔"

"اچھا تو پھر آپ کے اور ہمارے حساب کے مطابق وہ دُمدار ستارہ اٹھائیس دسمبر کو ہم سب کی موت بن کر آ رہا ہے۔ ایسے وقت لاکھوں کروڑوں انسانوں کے ہاتھوں کی لکیریں بتا رہی ہوں گی کہ ان کی عمر طویل ہے۔ وہ اٹھائیس دسمبر کے بعد بھی زندہ رہیں گے۔ اس صورت میں آپ کسے صحیح تسلیم کریں گے۔ ہاتھ کی لکیریں کو یا کومٹ کی لانے والی قیامت کو؟"

"واہ... واہ..." سب ہی اس ماہرِ فلکیات کی تعریفیں کرنے لگے۔ خورشید بلگرامی نے بھی اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی آپ نے اتنی ذہانت سے یہ سوال کیا ہے کہ تمام نجومی الجھ کر رہ جائیں گے۔ میں اپنی بات بتاؤں کہ میں الجھتا نہیں جانتا۔ میں اس دنیا کے ایک ایک فرد کا ہاتھ دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ اٹھائیس دسمبر سے پہلے ان کی ہتھیلی پر زندگی کی لکیر کیا کہہ رہی ہے۔ مگر ہم نجومی اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر لیتے ہیں۔ اس پابندی سے آگے بہت کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ کچھ اخلاقی ضابطے ہوتے ہیں اور کچھ انسانی نفسیات کے پیشِ نظر پیش آنے والی سچائی کو چھپانا پڑتا ہے۔"

ایک سائنسداں نے کہا۔ "اگر ہاتھ کی لکیریں سچ کہتی ہیں تو آپ کو کم از کم ہمارے درمیان سچ کہنا چاہیئے۔ ہم یہاں گنتی کے چند افراد ہیں اور ایک اہم خفیہ مشن کے سلسلہ میں میونخ پہنچنے والے ہیں۔ ہمارے درمیان جو بھی بات ہوگی وہ اس چار دیواری سے باہر نہیں جائے گی۔"

سب ہی اس سائنسداں کی تائید کرنے لگے کیونکہ سب ہی اپنے ہاتھ کی زندہ لکیروں کی میعاد معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ایک انجینئر خورشید بلگرامی کے سامنے ایک تپائی رکھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ایک بہت ہی مشہور نجومی نے میرا ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا کہ مستقبل میں میرے لیے خطرات ہیں مگر میں ایک لمبی زندگی گزاروں گا۔ اب آپ بتائیں۔"

خورشید بلگرامی بڑے غور سے اور سنجیدگی سے اس کی ہتھیلی پر زندگی کی لکیر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ لکیر عام نجومیوں کو یہی بتاتی کہ وہ اٹھائیس دسمبر کے بعد بھی زندہ رہے گا، لیکن خورشید بلگرامی نے پریشان نظروں سے مادام فلیچر کو دیکھا۔ بوڑھی مادام بھی اس کی ہتھیلی پر جھکی ہوئی تھی اور تمام لوگ مضطرب ہو کر ان دو نجومیوں کو دیکھ رہے تھے۔ مادام فلیچر نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"مسٹر خورشید! تم... میں... نہیں بتاؤں گی، آپ بتا دیں۔"

وہ ایک ہاتھ سے سر تھام کر صوفہ کی پشت سے ٹیک گئی۔

خورشید بلگرامی نے کہا۔

"جو لکیریں ہتھیلی پر نقش ہوتی ہیں، وہ حالات کے بدلنے سے مٹ نہیں جاتیں، صرف اپنا مزاج اور اپنا مفہوم بدل دیتی ہیں۔ ہماری دنیا میں چند ہی ماہرِ نجوم ایسے ہیں جو لکیروں کے بدلے ہوئے مفہوم کو پڑھ سکتے ہیں۔ مسٹر! اب میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا کیونکہ چھپانے کا وقت گزر چکا ہے۔ آپ... آپکی زندگی ختم ہو چکی ہے۔"

"نان سنس!" وہ انجینئر ایک قہقہہ لگاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی ہتھیلی کو چاروں طرف گھماتے ہوئے کہا۔

"ہاہاہاہا... دیکھو۔ یہ زندگی کی لکیر کہتی ہے کہ میں اپنے بچوں کے بچوں کو دیکھنے کے لیے زندہ رہوں گا اور یہ صاحب فرما رہے ہیں کہ ہاہاہاہا..."

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے تپائی کو ایک لات مار کر کہا۔

"اس سے بڑا مذاق اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں زندہ ہوں اور نجومی صاحب فرماتے ہیں کہ میری زندگی ختم ہو۔ ہاہاہا..."

وہ اپنے صوفہ پر واپس جانے کے لیے آگے بڑھا۔ پھر اچانک ہی لڑکھڑا گیا۔ گرتے گرتے سنبھلنے کے لیے اس نے ناشتہ کی ٹرالی کا سہارا لیا۔ کیک، پیسٹری اور تازہ پھلوں پر اوندھے منہ گرا۔ پھر وہ ٹرالی جھٹکا کھا کر رینگنے لگی۔ کھٹ کھٹا کھٹ کی آواز کے ساتھ لوگوں کے سامنے سے گزرتی ہوئی دروازے کی طرف جانے لگی۔

کھٹ کھٹا کھٹ۔ اس انجینئر کے دیدے پھیل گئے تھے۔ اس کا چہرہ ایک سائنسداں کے سامنے سے گزر گیا۔ کھٹ کھٹا کھٹ اس کے کھلے ہوئے منہ سے لہو کی دھار بہہ رہی تھی۔ وہ ایک ماہرِ فلکیات کے سامنے سے گزر گیا۔ کھٹ کھٹا کھٹ۔ وہ بے جان ہو کر ٹھہر گیا تھا اور بے جان ٹرالی ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر سب کو ہوش آیا کہ کچھ ہو گیا ہے۔ پھر سب نے آگے بڑھ کر اس ٹرالی کو پکڑ لیا۔ اس انجینئر کو اٹھا کر فرش پر لٹا دیا اور اس کی نبض کو تھام کر اور اس کے سینے پر کان رکھ کر اس کی زندگی کو تلاش کرنے لگے۔ آخر یہ بات سمجھ میں آگئی کہ انسان مر جائے تو اس کے جسم کے نقوش نہیں مٹتے۔ ہاتھ کی لکیریں بھی سلامت رہتی ہیں۔ اس مُردہ انجینئر کے ہاتھ پر زندگی کی وہ لکیر اب تک زندہ تھی۔

سب ہی کی نظریں ان دونوں کی جانب اٹھ گئیں۔ مادام فلیچر کے چہرے کی جھریاں اور گہری ہو گئی تھیں۔ اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا تھا۔ اس کی بوڑھی تجربہ کار آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

"میرے بچو! ہماری عائد کردہ پابندیوں سے آگے ہمارے علم کو آواز نہ دو۔ تمہیں دکھ پہنچے گا۔"

خورشید بلگرامی صوفہ کے دونوں ہتھوں پر ہاتھ رکھے صوفہ کی پشت سے ٹیک لگائے ایک مجسمہ کی طرح ساکت نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ اس وقت مقدر کی تحریریں بھی اس کا چہرہ نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ سیاہ چشمہ کے پیچھے مقناطیسی آنکھیں چھپ گئی تھیں۔ اچھا ہے، موت کو ایک راز کی طرح تاریک چشمہ کے پیچھے چھپا رہنا چاہیئے۔

★

ایک گھنٹہ بعد وہ سب طیارے میں بیٹھے ہوئے میونخ کی طرف جا رہے تھے۔ اس انجینئر کی موت کے سلسلہ میں ان سے صرف بیانات لیے گئے تھے۔ مزید تفتیش کے لیے انہیں روکا نہیں گیا تھا کیونکہ وہ سب معزز اور اہم افراد تھے اور ایک اہم مشن کے لیے میونخ جا رہے تھے۔ وی آئی پی لاؤنج چھوڑنے سے پہلے اتنا معلوم ہوا تھا کہ وہ انجینئر اعصابی مریض تھا اور اپنے اعصاب کو پُرسکون رکھنے کے لیے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دن میں تین وقت ایک کیپسول کھایا کرتا تھا اور وہ کیپسول ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں اس کے پاس رہتے تھے۔

اس کی جیبوں کی تلاشی لینے کے بعد وہ ڈبیہ نکلی۔ ایئرپورٹ کے ڈاکٹر نے بتایا کہ ان میں سے دو کیپسول مختلف اور مشکوک ہیں انہیں لیبارٹری بھیج دیا گیا۔ بس یہیں تک قیاس آرائی ہو سکی کہ کسی شخص نے اس کی ڈبیہ میں تین عدد زہریلے کیپسول رکھ دیئے تھے۔ دو اس ڈبیہ میں موجود رہے۔ ایک اس نے کافی پینے کے دوران نگل لیا جس کے نتیجہ میں موت واقع ہوئی۔

خورشید بلگرامی ایک سائنسداں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مادام فلیچر کو ہمت راؤ کے برابر جگہ ملی تھی۔ مادام نے کہا۔

"میں اس واقعہ کو کبھی نہیں بھلا سکوں گی۔ میری زندگی میں وہ پہلا شخص تھا جو موت کو گلے لگا کر مجھے اپنی ہتھیلی کی زندہ لکیر دکھانے آیا تھا۔ یہ پیش گوئی میں نے پہلی بار کی ہے کہ چند منٹ بعد کیا ہونے والا ہے اور وہی ہوا۔"

یہ کہہ کر وہ ہولے ہولے ہنسنے لگی۔ ہمت راؤ نے حیرانی سے وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا۔

"لوگ موت سے کیسے ڈرتے ہیں۔ اس کے مرنے کے بعد پھر کسی نے اپنا ہاتھ ہمارے آگے نہیں بڑھایا اور یہ اچھا ہی ہوا۔"

ہمت راؤ نے کہا۔ "یہ بات ہماری سمجھ میں آگئی ہے کہ ہمارے ہاتھوں میں زندگی کی کتنی ہی گہری لکیر ہو۔ ۲۸ دسمبر کے بعد اس دنیا میں زندگی کا نام و نشان نہیں رہے گا۔ لیکن مادام! تدبیر سے بڑی بڑی مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا ہم تدبیر کے ذریعہ اس دُمدار ستارے سے محفوظ نہیں رہ سکتے؟"

"میں بتا سکتی ہوں۔ یہ تدبیریں کرنے والے بتا سکتے ہیں
میرے ذرائع اتنے وسیع نہیں ہیں کہ میں کسی راکٹ میں بیٹھ کر خلا
میں پہنچ کر بتا رہا ہوں۔"
"آپ درست کہتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ بڑے
بڑے ممالک کیا کرتے ہیں؟"
"کچھ نہ کچھ تو ضرور کریں گے۔"
"مادام! آپ جیسی عالمی شہرت رکھنے والی خاتون سے
مل کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ میں اس ملاقات کو یادگار بنانا
چاہتا ہوں۔ میں آپ سے اپنی عمر یا موت کے بارے میں کچھ نہیں
پوچھوں گا۔ بس آپ میری زندگی کے تھوڑے سے حالات بتا دیں۔"
"آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟ ہر انسان سب سے پہلے
یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس کی زندگی کتنی طویل ہے۔ آپ اچھی
خاصی زندگی گزار چکے ہیں اور یہ خود ہی پوچھنا نہیں چاہتے کہ آئندہ
آپ کی عمر کتنی ہوگی۔ پھر انسان کی دوسری خواہشات کی طرح آپ
کے پاس دولت۔۔۔ اور شہرت بھی ہے پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟"
"میں صرف اپنی اولاد کی خوشیاں چاہتا ہوں۔ آپ مجھے
اتنا بتا دیں کہ میں اس کی خوشیاں دیکھ سکوں گا یا نہیں؟"
مادام فلیچر نے ہنستے ہوئے کہا۔
"تان دہیں آ کر ٹوٹی ہے کہ اولاد کی خوشیاں دیکھنے تک آپ کی
عمر ساتھ دے گی یا نہیں؟"
"نہیں بائی گاڈ میں طویل عمر نہیں چاہتا۔ اگر کل میں بیٹے کی
خوشیاں دیکھ لوں تو کل ہی خوشی سے مر جاؤں۔"
"اچھا آپ اس طرح سے پوچھ رہے ہیں تو میں آپ کا ہاتھ
ضرور دیکھوں گی۔"
ہمت راؤ نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔
مادام اپنے بوڑھے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ لے کر دیکھنے لگی۔ ہمت
راؤ کی نگاہوں کے سامنے اپنے بیٹے شنکر کا چہرہ تھا اور دل میں یہ
آرزو تھی کہ جوان بیٹا قیامت سے پہلے زندگی کی ساری خوشیاں
سمیٹ لے۔ مادام نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"میں پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ آپ بیٹے کی خوشیوں کا بہانہ
کر کے اپنی عمر معلوم کرنا چاہتے ہیں۔"
"آپ غلط الزام نہ دیں۔ میں آپ کی قدر کرتا ہوں۔"
"آپ میری قدر بھی کرتے ہیں اور مجھ سے جھوٹ بھی بولتے
ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں اولاد کی لکیر ہی نہیں ہے۔"
"ایں!" ہمت راؤ پہلے تو بوکھلا گیا۔ پھر ناراض ہو کر بولا۔
"یہی آپ کا علم ہے، میرا بائیس برس کا جوان بیٹا موجود ہے اور
آپ کہہ رہی ہیں کہ میرے ہاتھوں میں اولاد کی لکیر نہیں ہے۔"

مادام فلیچر نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"کیا آپ سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں کہ آپ کا اپنا بیٹا موجود ہے؟"
"میں بالکل سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔"
مادام نے اس کے دائیں ہاتھ کی مٹھی بند کر دی۔ اس کے
ہاتھ کو پرے ہٹا دیا۔ پھر آہستگی سے بولی۔
"میں آپ کو ایک بہت اچھا مشورہ دے رہی ہوں۔ کیا
آپ اس پر عمل کریں گے؟"
"ضرور عمل کروں گا۔"
"آپ آئندہ اپنا ہاتھ کسی نجومی کو نہ دکھائیں۔ اگر کبھی بحالت
مجبوری دکھانا بھی پڑے تو اس کے سامنے اپنی اولاد کا ذکر نہ کریں۔"
یہ کہہ کر وہ سیدھی بیٹھ گئی۔ پھر طیارے کی کھڑکی کے باہر بادلوں
کو دیکھنے لگی۔ ہمت راؤ کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ اس حقیقت کو
تسلیم کرنے سے ہچکچا رہا تھا کہ بائیس برس سے جو بیٹا اپنا ہے وہ
اپنا نہیں ہے۔ ۲۸ دسمبر سے پہلے وہ جس بیٹے کے لیے زندگی کی
ساری خوشیاں خریدنا چاہتا تھا اس بیٹے کو وہ رشتوں کے بازار
میں اپنے لہو سے نہیں خرید سکا تھا۔ وہ کسی پرائے لہو کا چھینٹا تھا۔
"چھی چھی۔ کیا میری پشپا، میری دھرم پتنی وہ پاپ کی
گٹھری کہیں سے لائی تھی۔ وہ تو بڑی سادتری سی وان نظر آتی
تھی۔ اس کی پتی سیوا دیکھ کر میں نے بھی اس پر شبہ نہیں کیا تھا۔"
اس کے دماغ نے سمجھایا "پہلے شبہ نہیں کیا۔ اب تو ماضی
میں جھانک کر سمجھنا ہوگا کہ شنکر راؤ آیا کہاں سے؟"
وہ سوچنے لگا "میں ماضی کو کہاں سے دیکھوں؟ اس وقت
سے جب پشپا دھرم پتنی بن کر میری زندگی میں آئی تھی۔ نہیں۔
اس وقت عورت دلہن کے روپ میں اتنی حسین ہوتی ہے اور
جوانی کے سب رنگ نکھر پھیلا کر مرد کے حواس پر اس طرح چھا
جاتی ہے کہ اس کے فریب کو سمجھنے کے لیے موقع نہیں ملتا۔"
وہ گرین وچ رائل آبزرویٹری سے ایک ماہ کی چھٹی لیکر
بھارت آیا تھا پھر پشپا کو بیاہ کر لے گیا تھا۔ اس نے ایک ماہ
کے بعد ہی اسے خوش خبری سنائی کہ اس کے پاؤں بھاری ہو
گئے لہٰذا وہ تین ماہ بعد مدراس اپنے میکے واپس چلی گئی۔ پھر پانچ
ماہ بعد خبر ملی کہ پشپا نے سات ماہی بچے کو جنم دیا ہے۔ سات ماہ میں
بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی دھرم پتنی پر شبہ نہیں کر سکتا
تھا۔
اب سوچنے سے ساری بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ پشپا کا
ایک چچازاد بھائی بلدیو تھا۔ وہ شادی سے پہلے بلدیو کے ساتھ کالج
میں پڑھتی تھی۔ اس سے زیادہ اس نے ہمت راؤ کو نہیں بتایا تھا
کہ بلدیو کے ساتھ عشق کا سبق بھی پڑھتی تھی۔ مگر بلدیو سچا عاشق ثابت

ہوا۔ اس نے تمام عمر شادی نہیں کی، اور شادی کی ضرورت بھی
کیا تھی۔ ہمت راؤ گرین وچ میں مصروف رہتا تھا۔ پشپا کو اپنے
پاس بلاتا تو وہ ایک دو ماہ کے لیے آ جاتی۔ پھر کبھی مغربی ماحول
سے گھبرا کر اور کبھی بیماری کا بہانہ کر کے ہندوستان واپس چلی جاتی
وہاں ہمت راؤ کا اپنا سگا کوئی نہ تھا اس لیے وہ اپنے میکے میں اپنے
چچا کے پاس رہتی تھی اور چچا کے لڑکے کے ساتھ وقت گزارتی تھی۔
پندرہ برس بعد پشپا اس دنیا سے سدھار گئی۔ اس کے تین
برس بعد ہمت راؤ گرین وچ رائل آبزرویٹری سے استعفیٰ دے کر
ہندوستان واپس آ گیا تاکہ اپنے بیٹے کے ساتھ باقی زندگی گزارے۔
دو برس بعد فولاد کے بہت بڑے کارخانہ کے مالک بلدیو نے ہمت
راؤ اور شنکر کو اپنے گھر بلایا۔ وہ بستر پر پڑا زندگی کی آخری سانسیں
لے رہا تھا۔ اس نے ہمت راؤ سے کہا۔
"میں نے شادی نہیں کی۔ اس سنسار میں میرا اپنا کوئی نہیں
ہے۔ میں نے اپنے وکیل کو وصیت لکھ کر دے دی ہے۔ میرے
بعد میری پندرہ کروڑ کی جائیداد کا مالک شنکر ہوگا۔ پشپا میرے تایا
کی بیٹی تھی۔ سب سے قریبی رشتہ اسی سے رہا۔ اسی رشتہ کو
نبھاتے ہوئے میں شنکر کو اپنا بیٹا کہتا ہوں۔ بیٹے! میرے پاس
آؤ۔ میرے سینے سے لگ جاؤ۔"
شنکر آگے بڑھ کر اس پر جھکا۔ پھر اس کے سینے سے لگ
گیا۔ اس کے ساتھ ہی بلدیو کا دم نکل گیا۔
ہمت راؤ ساری عمر اپنے بیٹے کو اتنی دولت نہیں دے
سکتا تھا۔ جتنی کہ بلدیو اپنے بیٹے کو دے گیا تھا۔ ہمت راؤ تو یہی سمجھتا
رہا کہ شنکر کو اس کے ننھیال سے وہ دولت ملی ہے۔ پر اب دودھ
کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا تھا۔ ساری ڈھکی چھپی باتیں ہمت
راؤ پر روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھیں۔
طیارہ میونخ کی جانب محو پرواز تھا۔ ہمت راؤ کی پرواز
تھک کر اپنے حال کی طرف واپس آ گئی تھی۔ وہ بار بار اپنے ہاتھ
کی لکیروں کو دیکھ رہا تھا۔
"اے لکیرو! تم کتنی ظالم ہو۔ تم نے میرا بائیس برس کا جوان
بیٹا مجھ سے چھین لیا۔ تم نے اسے زندہ رکھا مگر میرے لیے اسے مار
ڈالا۔ اب میں اسے بیٹا کیسے کہوں؟
میں اسے بیٹا کہوں گا تو اب وہ سماجی رسم نبھانے والی
بات ہو گی۔ اپنی شرم رکھنے والی ایک مجبوری ہو گی۔ میں اسے
لاکھ بیٹا کہہ کر پکاروں مگر وہ پکار میرے لہو کی حرارت سے نہیں
اٹھے گی۔
اب میرے سامنے کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے جسے میں گھمنڈ
سے کہہ سکوں کہ میں نے تمہارے لیے شہرت حاصل کی اور تمہارے

ایک شخص ڈنر پر اپنے باس کو لے کر آیا۔ ایک عورت نے دروازے
پر ان کا استقبال کیا۔ باس نے سرگوشی میں پوچھا "یہ عورت تمہاری
بیوی ہے؟"
اس شخص نے کہا "خود ہی غور فرمائیے۔ بھلا کوئی بھی اچھا بھلا
انسان اتنی بھدی اور بدصورت عورت کو ملازم رکھ سکتا ہے۔"

فیکٹری میں اسے پہلا ہی دن تھا کہ ایک فورمین اس کے پاس
آیا اور پوچھنے لگا "کیا تم ہماری فٹ بال ٹیم میں شامل ہونا پسند کرو گے؟"
"یقیناً پسند کرتا" اس نے جواب دیا "مگر مجبوری یہ ہے کہ
میں نے آج تک کبھی فٹ بال نہیں کھیلی۔"
"کوئی حرج نہیں" فورمین نے کہا "ہمیں کسی کھلاڑی کی نہیں،
ریفری کی ضرورت ہے۔"

لیے بوڑھا ہو گیا۔ یہ کہتے وقت میری گردن جھک جاتی کہ میں
ایک پتی ورتا عورت کا سہاگ نہیں تھا۔ صرف ایک سائن بورڈ تھا۔
اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے گوشوں پر
آنسو کی دو بوندیں لرز رہی تھیں۔ دنیا پر گزرنے والی قیامت ابھی
دور تھی۔ وہ بند آنکھوں کے پیچھے دل پر گزرنے والی قیامت کا
منظر دیکھ رہا تھا۔

★

میونخ کے ایک بہت پرانے قلعہ شلوس نمفین برگ کے
ایک بہت بڑے ہال میں اجلاس جاری تھا۔ بڑی سی مستطیل
میز کے اطراف دنیا کے اہم ترین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں کا
ہر فرد زندگی کے مختلف شعبوں میں غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل تھا۔
ان میں مادام فلیچر خورشید بلگرامی اور ہمت راؤ بھی شامل تھے۔
وہ اجلاس کا تیسرا اور آخری دن تھا۔ اور وہ ڈیڑھ ارب کے
سے اپنی دنیا کو محفوظ رکھنے کے لیے کسی آخری نتیجہ تک پہنچ چکے
تھے۔ اجلاس کا صدر ایک یہودی تھا۔ وہ دنیا کا سب سے دولتمند
انسان تھا۔ اس کی دولت کے بل پر حفاظتی اقدامات کیے جانے
والے تھے۔ اس لیے اسے صدارت کی کرسی پر بٹھایا گیا تھا۔ اس
کے چہرے پر آنکھوں کی ایک دکان بند تھی۔ ایک آنکھ پر چمڑے
کا چوکور ڈھکن چڑھا رہتا تھا۔ دوسری آنکھ سامنے والوں کو
گھورتی رہتی تھی۔ قیامت کے قریب پہنچ کر اسے دیکھتے ہی
کانا دجال یاد آ جاتا تھا۔
اس نے اپنے سامنے میز پر پڑے ہوئے تمام کاغذات
کو ترتیب سے رکھنے کے بعد پڑھنا شروع کیا۔ اس کی آواز بڑی

گونجتی اور گرجتی ہوئی تھی اور وہ سخت اور پتھر جیسے لہجے میں نتائج بیان کر رہا تھا۔

"معزز حاضرین! آپ نے مدتی دمدار ستارے کے سلسلے میں سیر حاصل اور فیصلہ کن بحث کی ہے۔ اس بحث کے بعد ہم جن نتائج تک پہنچے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ ماہر نجوم اور ماہر فلکیات نے تصدیق کر دی ہے کہ وہ دمدار ستارہ بلاشبہ ہماری زمین کی طرف آ رہا ہے۔

۲۔ کالکولیٹنگ مشین اور ماہرین کے حسابات کے مطابق وہ ستارہ ۲۸ دسمبر کو پاکستانی نجومی کے حساب سے پاکستانی وقت کے مطابق چھ بج کر بارہ منٹ پر اور ہمارے وقت کے مطابق صبح چھ بج کر بیالیس منٹ پر زمین سے ٹکرائے گا۔

۳۔ فلکی اجسام کے عالموں کی رپورٹ ہے کہ وہ دمدار ستارہ صرف گیس کا مجمع نہیں ہے بلکہ ایک ٹھوس مادی جسم ہے۔ اب تک کے اندازے کے مطابق وہ ستارہ جسامت میں دس ہزار میل چوڑا اور پینتیس ہزار میل لانبا ہے اور سات سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آ کر زمین سے ٹکرائے گا۔

۴۔ جب وہ ستارہ زمین کے مدار کے قریب پہنچے گا تو اسی وقت سے ہماری زمین ابتدائی طور پر متاثر ہوگی۔ پہلے زلزلے آئیں گے، پھر سمندر کی تہہ سے طوفان اٹھیں گے۔ طوفانی لہریں ایسی غضبناک ہوں گی کہ چھوٹے چھوٹے جزیرے سمندر کی تہہ میں چلے جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے ہماری دنیا کے نقشے سے مٹ جائیں گے۔

۵۔ ۲۸ دسمبر کی قیامت سے پہلے جو قیامت آئے گی اس کا صرف تصور کیا جا سکتا ہے، اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ قانون کا احترام ختم ہو جائے گا۔ عوام کنٹرول سے باہر ہو جائیں گے۔ ایسے بہت کم ہوں گے جو ہوش و حواس میں قائم رہ کر مزید پُرسکون رہنے کے لیے اپنی اپنی عبادت گاہوں میں جائیں گے۔ اکثریت ان لوگوں کی ہوگی جو دہشت زدہ ہو کر جنونی حرکتیں کریں گے۔

کل ۱۴ اگست کے اجلاس میں یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ ہم اپنی دنیا کو کس طرح بچا سکتے ہیں۔ وہ دمدار ستارہ ہماری زمین سے کئی گنا بڑا ہے اور وہ ایسی غضبناک رفتار سے ٹکرائے گا کہ شاید ہی زمین کا کوئی حصہ اس کی زد سے باہر رہ سکے۔ لہٰذا کل ہم اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ پوری دنیا کو بچانا ناممکن ہے۔

تاہم اس مسئلہ پر تمام ممالک کی فوج کے اعلیٰ افسران غور کر رہے ہیں۔ اگر ممکن ہوا تو خلائی اسٹیشنوں سے دمدار ستارے پر راکٹ برسائے جائیں گے۔ یہ حملے اگر کامیاب ہوئے تو ستارہ کئی ٹکڑوں میں بکھر جائے گا۔ اس طرح وہ پورا کا پورا زمین سے نہیں ٹکرائے گا۔ ہماری دنیا کا بہت سا حصہ اس کی زد سے محفوظ رہے گا۔

اگر ہم اپنی دنیا کو نہ بچا سکے تو اس صورت میں محدود پیمانے پر سوچا گیا کہ ہم اپنی دنیا کی تہذیب و ثقافت کو طبی اور سائنسی تجربات کو اور تاریخ اور لٹریچر کو کس طرح محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ اور آپ حضرات جو اس دنیا کے بڑے بڑے دماغ ہیں اور غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ سب سے پہلے آپ لوگوں کی حفاظت ہم پر لازم ہے۔"

صدر نے اتنا پڑھنے کے بعد کاغذات کو میز پر رکھ دیا۔ پھر حاضرین پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگوں کی حفاظت کے لیے جو منصوبہ بنایا گیا ہے۔ اسے پیش کرنے سے پہلے میں ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ آپ لوگوں میں سے کتنے ایسے ہیں جو ہماری اس دنیا کو قیامت کے بعد دوبارہ آباد کرنے کے لیے اپنے بیوی بچوں اور دوسری محبتوں کی قربانی دے سکتے ہیں۔"

سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ صدر اپنی ایک آنکھ سے ہال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"میں ذرا وضاحت کر دوں کہ آپ حضرات کو حفاظت کے لیے جس پناہ گاہ میں بھیجا جائے گا۔ وہاں آپ کے بیوی بچوں کے لیے گنجائش نہیں ہوگی۔ آپ خوب سوچ سمجھ کر جواب دیں۔ آپ کو برسوں کے خون کے رشتوں کو توڑنا ہے اور موجودہ حالات میں یہ کچھ مشکل نہیں ہے جبکہ زمین سے ہمارا صدیوں کا رشتہ ٹوٹنے والا ہے۔"

تھوڑی دیر تک سب لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے اس کے بعد چار سائنسداں، تین انجینئروں اور دو ڈاکٹروں نے بتایا کہ انہوں نے شادی نہیں کی۔ ان کے اپنے خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ ساری دنیا کو چھوڑ کر پناہ گاہ میں جائیں گے۔

دس افراد نے کہا کہ وہ گھریلو ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں اگر قیامت کے بعد انسانی زندگی کی از سرِ نو ابتدا کی جا سکتی ہے تو اتنی بڑی دنیا کو آباد کرنے کے لیے وہ ایک گھر کی قربانی دے سکتے ہیں۔

ایک نے کہا "میری بیوی حسین ہے اور جوان ہے۔ میں ہمیشہ اس کے حسن و شباب کا پہریدار بن کر نہیں رہ سکتا۔ اگر قیامت کے بعد دوسری مل جائے تو میں اسے چھوڑ کر پناہ گاہ میں آجاؤں گا۔"

اس کے بعد بمت راؤ کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس نے ٹوٹے ہوئے دل سے کہا۔

"اس دنیا کے سب رشتے جھوٹے ہیں۔ میرا ایک بیٹا تھا، وہ مر گیا۔ میں ایک نئی دنیا کے لیے زندہ رہوں گا۔"

فلپائن کے ایک ماہر نباتات نے کہا۔

"میں مجبور ہوں۔ مجھے اپنی بیوی سے بہت محبت ہے۔ میں اپنے گھر کی جنت میں قیامت کا انتظار کروں گا۔"

مادام فلیچر نے کہا "میرا ایک جوان بیٹا ہے، بہو ہے اور پیارے پیارے پوتے پوتیاں ہیں۔ میں ان کے ساتھ مرنا پسند کرتی ہوں۔"

پروفیسر خورشید بگرامی نے کہا "میری ایک جوان بیٹی تھی سعدہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ویسے تو اس دنیا میں اب میرا کوئی نہیں ہے مگر سب ہیں۔ رشتہ صرف خون کا نہیں ہوتا، اپنے وطن کی مٹی کا رشتہ غیرت اور آن کا رشتہ ہوتا ہے۔ میں اپنے وطن کے لوگوں کے ساتھ مروں گا۔"

ایک آنکھ ان لوگوں کو گھور رہی تھی جو خون کا اور زمین کا رشتہ نہیں توڑنا چاہتے تھے۔ اس ایک آنکھ نے مکاری سے مسکرا کر کہا۔

"صرف ہمارے تین معزز ساتھی ہمارا ساتھ چھوڑنا چاہتے ہیں۔ نیور مائنڈ، اس اجلاس کے بعد آپ تینوں کو بخیریت آپ کے گھروں تک پہنچا دیا جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ میز پر سے کاغذات اٹھا کر دوبارہ پڑھنے لگا۔

"معزز حاضرین! سینکڑوں ہزاروں سالوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس زمین پر پہلے بھی کئی بار آسمانی آفات نازل ہو چکی ہیں۔ نینوا، بابل کی تباہی، دی لیجنڈ آف دی وسٹ اٹلانٹس وغیرہ اس کی مثال ہیں۔ لیکن اس وقت زمین ساری کی ساری تباہ نہیں ہوئی تھی۔ تاریخ میں یہ بھی نقطۂ نگاہ ہے جنہیں آسمانی آفات کہا جاتا ہے۔ اس کے پس پردہ یہی حقیقت رہی کہ اس زمانے میں بھی فلکی اجسام اپنی راہ سے بھٹکتے تھے، خلا سے زمین کی طرف آتے تھے اور اس دور کے لوگ محدود معلومات کے پیشِ نظر اسے آسمانی آفات کہتے تھے۔

اگر ۲۸ دسمبر کو تباہی اس طرح آتی ہے کہ تمام سمندروں کا پانی اچھل کر اس زمین کو اپنے اندر چھپا لے تو پھر ہمیں حضرت نوحؑ کی طرح ایک بہت بڑی کشتی بنوانی ہوگی۔ ہمارے ماہر انجینئروں نے ایسی کشتی کے سلسلہ میں زبردست پلاننگ کی ہے اور اس کا ڈیزائن بھی تیار کیا ہے۔ حضرت نوحؑ کے زمانے میں انجینئرنگ آج جیسے ترقی یافتہ نہیں تھی۔ ہماری کشتی ایک بہت بڑے فٹ بال کی شکل کی ہوگی اور اس میں واٹر ٹائٹ دروازے اور پورٹ ہول ہوں گے۔ پانی اندر نہیں آسکے گا۔

اس گیند نما کشتی کی بلندی ایک سو آٹھ فٹ ہوگی، یہی اس

کا قطر ہے۔ ہم نے اس کشتی کو گلوب آرک کا نام دیا ہے۔ یہ گلوب آرک اپنی گولائی کے باعث طوفانی لہروں کی زد میں کسی طرف بھی لڑھکتا رہے گا۔ لیکن اس کے اندر جو ہمارے رہائشی حصہ کا ڈھانچہ ہوگا۔ وہ اپنی جگہ ساکت رہے گا۔ یعنی جیرو سکوپ سسٹم (GYROS COPES) کے مطابق وہ گلوب آرک ہوگا۔ جس کا بیرونی گول ڈھانچہ گھومتا رہے گا اور اندرونی جو کور رہائشی ڈھانچہ جیرو سکوپ رنگ کے درمیان بیرونی جھٹکوں سے محفوظ اور ساکت رہے گا۔

یوں تو ہوا کی آمد و رفت کے لیے پورٹ ہول بنائے جائیں گے لیکن جب انہیں بند کیا جائے گا تو اندر آکسیجن کا اتنا ذخیرہ ہوگا کہ ہمیں سانس لینے میں سہولت رہے گی۔

گلوب آرک کا بیرونی حصہ ایسی دھات کا بنا ہوا ہوگا جسے دمدار ستارے سے بکھرنے والے اور آگ برسانے والے ٹھوس ٹکڑے نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

گلوب آرک میں کم از کم دس ماہ کا راشن ہوگا اور ہمارے لیے ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز موجود ہوگی۔ جب قیامت گزر جائے گی اور ہم زمین کے کسی ایسے حصے میں پہنچیں گے جو دمدار ستارے سے زیادہ متاثر نہ ہوا ہو۔ یا صرف سمندر کی طوفانی لہروں میں ڈوب گیا ہو تو زمین کے اس حصے سے پانی ضرور اترے گا اور سمندر کی سطح میں واپس جائے گا تب ایک نئی دنیا آباد کرنے کا مسئلہ درپیش ہوگا۔

اس دوران دنیا میں نئے سرے سے کھیتی باڑی اور باغبانی کے لیے ہمارے پاس اہم پودوں کے بیج اور جڑوں کا اسٹاک موجود ہوگا۔ ہماری اس دنیا کی تاریخ، لٹریچر، سائنس، طب، ریاضی، میکانزم اور انجینئرنگ پر لکھی ہوئی مستند کتابوں اور سائنس اور انجینئرنگ کے تمام آلات کا ذخیرہ ہوگا۔

جس نئی دنیا کو ہم آباد کریں گے اسے آئندہ بھی قائم رکھنے کے لیے عورت سب سے اہم ہے۔ اگر آپ اپنے ساتھ اپنی بیوی

کو ایسی عورت کو لا سکتے ہیں جس کے ساتھ بچہ نہ ہو تو اس کے لیے گلوب آرک میں گنجائش نکل آئے گی جو عورتیں گلوب آرک میں آئیں گی ان کے لیے چند شرائط ہیں۔

پہلی شرط یہ کہ عورتیں حسین اور صحت مند ہوں تاکہ آئندہ نسل بھی خوبصورت اور صحت مند ہو۔ دوسری شرط یہ کہ وہ بانجھ نہ ہوں۔ ان کا باقاعدہ طبی معائنہ ہوگا۔ تعلیم یافتہ اور ہنرمند عورتوں کو ترجیح دی جائے گی۔ اگر تعلیم اور ہنر نہ ہو تو کم از کم ان میں گھر گرہستی کا سلیقہ ضرور ہونا چاہیے۔

ہمارے نئے سفر، نئی زندگی اور نئی دنیا کے سلسلے میں آپ حضرات کے قابلِ قدر مشوروں کا آئندہ بھی خیر مقدم کیا جائے گا۔ اس اجلاس کے آغاز میں کہا جا چکا ہے کہ رازداری شرط ہے۔ اگر اس اجلاس کا ایک بھی راز ہماری زبان سے نکل کر اس چار دیواری سے باہر جائے گا تو دوسرے ممالک کے حکمران ہمارے گلوب آرک میں پناہ لینے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں گے۔ عوام تک خبر پہنچے گی تو وہ ہمارے لیے دردِ سر بن جائیں گے۔ ساری دنیا گلوب آرک کی طرف کھنچی چلی آئے گی۔ پھر ہمارا مشن ناکام ہو جائے گا۔

میں آپ سے رازداری کی توقع کرتے ہوئے نیک خواہشات کے ساتھ اس اجلاس کے اختتام کا اعلان کرتا ہوں۔"

سب لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھنے لگے۔ صدر نے ایک آنکھ سے تین افراد کو دیکھا۔ ایک فلپائن کا ماہرِ نباتات جس کا نام ہاتورا تھا، دوسری مادام فلیچر اور تیسرا خورشید بلگرامی تھا۔ اس نے تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ تینوں ہمارے مشن میں شریک نہیں ہو رہے ہیں لہٰذا آج شام چھ بجے آپ اپنے اپنے وطن واپس جانے کے لیے ایئرپورٹ پہنچ جائیں۔ وِش یُو آل۔"

شام کو میوزک کے ہاؤس انٹرنیشنل (ہوٹل) میں دنیا کے اہم ترین افراد کے لیے کاک ٹیل پارٹی تھی۔ بھرت راؤ پینے کا عادی نہیں تھا مگر ایسی پارٹیوں میں چکھ لیا کرتا تھا۔ یوں بھی غم غلط کرنے کے لیے پینا ضروری ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے پہلے پیگ میں پشپا کی بے وفائی کو بھلایا۔ دوسرے پیگ میں جوان بیٹے کو مار ڈالا۔ اب شنکر کے بجائے اس کی نگاہوں کے سامنے بدلو کا بیٹا آتا تھا۔ تیسرے پیگ میں ایک انگریز حسینہ اس کے پاس آ گئی۔

اس نے سوچا "آہ! میں نے کتنے عرصے سے عورت کو بھلا دیا تھا۔ میں احمق تھا کہ پہلے بیٹے کی شادی کے لیے سوچتا تھا (آگے)، کیا بیٹا؟ کہاں کا بیٹا؟" (ایک گھونٹ وہسکی پی کر) خون کے کتنے ہی رشتے بے حیا بیوی کے چور دروازے سے آتے ہیں (دوسری ہچکی) بہتر ہے کہ حسین عورت کو بیوی نہ بناؤ۔ اسے بیڈ روم کے اگلے دروازے سے بلاؤ اور پچھلے دروازے سے رخصت کر دو۔ ٹھیک۔"

تیسری ہچکی میں بھرت راؤ نے انگریز حسینہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"میری جان! تم نے دُمدار ستارہ دیکھا ہے؟ ابھی نہیں دیکھا۔ آؤ میں اپنے بیڈ روم کی بالکونی سے تمہیں دکھاؤں۔۔۔"

وہ حسینہ کے ساتھ ڈگمگاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔

بڑے ہال میں شراب کے جام کھنک رہے تھے اور آرکسٹرا کے پس منظر میں مرد عورتوں کے قہقہے بے لگام ہو رہے تھے۔ ایک ڈاکٹر نے ایک سائنسدان سے کہا۔

"آپ نے اجلاس میں کہا تھا کہ آپ اپنی بیوی کے حسن و شباب کے پہریدار نہیں رہ سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اسے چھوڑ کر گلوب آرک میں جائیں گے۔"

"ہاں اب وہ میرے لیے پرانی ہو چکی ہے۔" اس نے اپنے جام سے ایک گھونٹ پیا۔

"وہ میرے لیے نئی ہے۔" ڈاکٹر اپنے لیے ایک پیگ بنانے لگا۔

"اوہ سمجھا۔ تم میری بیوی ریٹا کو کیسے جانتے ہو؟"

"وہ ایک بار علاج کے سلسلے میں آئی تھی۔ میں نے اس کا معائنہ کیا تو مجھے اچھی لگی۔"

"کوئی بات نہیں تم اسے اپنے ساتھ گلوب آرک میں لے جاؤ۔"

"لیکن مسٹر برنارڈ! وہ شوہر پرست ہے۔ میں نے اسے چھیڑا تھا۔ وہ ہاتھ نہیں آئی۔"

"آ جائے گی۔ میں اسے طلاق دے دوں گا۔ چوٹ کھائی ہوئی عورت دوسری شادی کے لیے ایسے مرد کا انتخاب کرتی ہے جو ساری زندگی اس کا محافظ بن کر رہ سکے۔ جب ریٹا کو یہ معلوم ہوگا کہ تم اسے قیامت سے بچا سکتے ہو تو وہ تمہاری ہو جائے گی۔"

"شکریہ مسٹر برنارڈ۔۔۔" ڈاکٹر نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا برنارڈ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مگر میں ایک شرط پر ریٹا کو طلاق دوں گا۔ تمہاری بیٹی میرے ساتھ گلوب آرک میں جائے گی۔"

ڈاکٹر کے دماغ کو ایک جھٹکا پہنچا۔ ایک بوڑھا اس کی نوجوان کنواری بیٹی میری کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اس نے غصہ غلط کرنے کے لیے ایک گھونٹ پیا تو عقل آ گئی۔ وہ اپنی بیٹی میری کو بہت چاہتا تھا۔ اگر وہ غیرت کو ذرا سی شراب میں گھول لے تو بیٹی بھی قیامت سے محفوظ رہنے کے لیے گلوب آرک میں پہنچ جائے گی۔ یوں بھی دنیا میں کتنے ہی لوگ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی شادی مجبوری کی حالت میں بوڑھوں سے کر دیتے ہیں۔ اس نے کہا۔

"یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ میری سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"شادی؟" برنارڈ نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "شادی وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی مذہب ہوتا ہے۔ گلوب آرک میں کوئی مذہب نہیں ہوگا۔"

"یہ آپ کیسے کہتے ہیں؟"

"ڈاکٹر! کیا آپ اجلاس کے وقت سو رہے تھے۔ آپ نے سنا نہیں کہ اس دنیا کی ہر اہم چیز اور اہم افراد گلوب آرک میں جائیں گے لیکن کسی مذہب کے پیشوا کے لیے وہاں گنجائش نہیں نکالی گئی۔"

"اوہ۔ تو کیا نئی دنیا میں کوئی مذہب نہیں ہوگا؟"

"ہوگا۔ شاید یہودیت ہوگی۔ گلوب آرک میں لے جانے کے لیے ایسے سائنسدانوں، ڈاکٹروں اور انجینئروں وغیرہ کا زیادہ انتخاب کیا گیا ہے جو یہودی ہیں۔ اس قافلہ کو ترتیب دینے والا وہ اجلاس کا صدر جیرالڈ موس بھی یہودی ہے۔ ہمارے تمہارے جیسے عیسائی، بدھسٹ، ہندو اور مسلمان صرف ایک دو ہیں۔ وہ بھی محض اس لیے کہ ہماری صلاحیتیں لاجواب ہیں۔ نئی دنیا میں انہیں ہماری ضرورت ہوگی۔"

"ڈیم کیئرز" ڈاکٹر نے لاپروائی سے کہا۔ "مجھے ذاتی طور پر مذہب سے دلچسپی نہیں ہے۔"

"تو پھر شادی وغیرہ کی رسمی باتیں نہ کرو۔ میری بیوی ریٹا تمہاری اور تمہاری بیٹی میری، میری ہوگی۔ بولو ڈن؟"

"ڈن۔" ڈاکٹر نے مصافحہ کی صورت میں معاہدہ کر لیا۔

کاک ٹیل پارٹی کی مستیاں عروج پر تھیں۔ ہماری یہ بڑی دنیا ہو یا گلوب آرک کی محدود دنیا ہو کہیں بھی انسان سماجی رشتوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے گلوب آرک میں جانے سے پہلے نئے رشتوں کی زنجیریں بنی اور پہنائی جا رہی تھیں۔ وہاں لوگ ایک دوسرے سے رشتوں کی سودے بازی کر رہے تھے اور بڑی فراخدلی سے یقین دلا رہے تھے کہ تمہاری بیٹی، تمہاری بہن، تمہاری جوان پھوپھی، تمہاری جوان خالہ کو قیامت سے میں بچاؤں گا۔ تم بچاؤ گے۔ وہ بچائے گا۔ آخر انسان کو انسان کے کام آنا چاہیے۔

جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ قیامت اچانک ہی آ جائے گی تو وہ غلطی پر ہیں۔ قیامت پہلے مہذب انسانوں کے درمیان آتی ہے۔ وہ دُمدار ستارہ زمین سے ٹکرانے سے پہلے انسانوں کے اخلاق اور تہذیب پر قیامت بن کر ٹوٹ رہا تھا۔ جو لوگ آنیوالی قیامت سے باخبر تھے وہ پرانی دنیا سے رشتے توڑ کر ایسی نئی دنیا کی طرف جا رہے تھے جہاں باپ اپنی بیٹی کے ساتھ، بھائی اپنی بہن کے ساتھ، بیٹا اپنی ماں کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا۔ اس گلوب آرک کے معزز مسافر صرف اپنی اپنی داشتاؤں کے ساتھ جا سکتے تھے۔

●

طیارے میں صرف تین مسافر تھے۔ فلپائن کا ہاتورا، امریکہ کی مادام فلیچر اور پاکستان کا خورشید بلگرامی۔ وہ تینوں اپنی اپنی سیٹ پر رات کے کھانے میں مصروف تھے۔ ایک ایئرہوسٹس ان کی خدمت

کے لیے موجود تھی۔ وہ تینوں شام کو چھ بجے ایرپورٹ پہنچ گئے تھے نو بجے طیارے میں سوار ہوئے تھے۔ ساڑھے نو بجے طیارے نے پرواز شروع کی تھی، اور اب پونے گیارہ بجے وہ رات کے کھانے سے فارغ ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد مادام فلیچر نے کہا۔

"مسٹر خورشید! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میں نے تین دن پہلے اپنی جنم پتری دیکھی تھی۔"

"میں نے بھی دیکھی تھی۔" خورشید بلگرامی نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کا ستارہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"وہی جو آپ کا کہہ رہا تھا۔ یعنی یہ کہ ۱۳ اگست کو ہمیں سفر نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے تفصیل معلوم کی تو پتہ چلا کہ مغرب کی سمت سفر کرنے میں خطرہ ہے مگر نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس لیے میں چلا آیا۔"

مادام نے کہا۔ "میرا ستارہ سختی سے منع کر رہا تھا کہ مجھے مشرق کی جانب سفر نہیں کرنا چاہیے لیکن مجھے اپنی پوتی سے بہت محبت ہے۔ میں اس کی ہر ضد پوری کرتی ہوں۔ ہمارا پڑوسی اپنی بچی کے لیے جرمنی سے ایک گڑیا لایا تھا۔ وہ گڑیا رینگتی تھی اور نظم پڑھتی تھی۔ ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار۔ ہاؤ آئی ونڈر وہاٹ یو آر..... میری پوتی لارا کی ضد تھی کہ وہ بھی ایسی ہی گڑیا لے گی۔ آپ اسے ایک دادی کی اندھی محبت کہہ لیں۔ جب مجھے سرکاری طور پر فرینکفرٹ جانے کا حکم دیا گیا تو میں فوراً ہی تیار ہو گئی۔"

خورشید بلگرامی نے کہا۔ "آپ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیں کہ ستارے منع کرتے ہیں لیکن تقدیر اپنی تحریک کے پل صراط پر ضرور چلاتی ہے۔"

مادام فلیچر نے ایک گہری سانس لی۔ پھر اپنے سامنے رکھا ہوا ہینڈ بیگ کھول کر اس میں سے گڑیا نکالنے لگی۔ ہاتورا نے کہا۔

"مسٹر خورشید! آپ درست کہتے ہیں۔ میں نجومی نہیں ہوں مگر میں نے اکثر آزمایا ہے کہ کوئی مصیبت آنے سے پہلے میری بیوی کی بائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔ وہ مجھے منع کر رہی تھی کہ میں نہ جاؤں۔ مگر دیکھیے تقدیر مجھے یہاں لے آئی۔"

خورشید بلگرامی نے دلاسہ دیا۔

"فی الحال تقدیر سے شکوہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہم سب بخیریت اپنے اپنے گھروں کو واپس جا رہے ہیں۔"

"میں نہیں مانتا۔" ہاتورا نے کہا۔ "دیکھیے مادام کو امریکہ جانا ہے اور ہم دونوں کو مشرق کی طرف جانا چاہیے۔ مگر یہ طیارہ ہم تینوں کو ایک وقت کہاں لے جا رہا ہے؟"

مادام نے کہا۔ "میں نے ایرپورٹ میں اس کمانڈر جیرالڈ موس سے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ طیارہ ہم تینوں کو استنبول پہنچائے گا وہاں سے ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے۔"

مادام نے گڑیا میں چابی بھر کر اسے فرش پر چھوڑ دیا۔ وہ رینگ رہی تھی اور آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہہ رہی تھی۔

"ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار (اے ننھے ٹمٹمانے والے ستارو! میں کتنی حیران ہوں کہ آخر تم کیا ہو؟)

تم کیا ہو ستارو؟ ننھی لارا پوچھ رہی ہے۔ دادی کی آنکھوں میں مسرتوں کے آنسو تمہاری طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

ستارو! تم قیامت تو نہیں ہو نا؟

یہ رشتوں کا سودا کرنے والی دنیا ابھی لارا کی طرح معصوم اور دادی جان کی محبت کی طرح پاکیزہ اور بے غرض ہے۔ مشرق کی سیتا اور فاطمہ، مغرب کی مریم اور لارا جیسی لاکھوں کروڑوں ننھی منی بچیاں آسمان کی طرف سر اٹھائے حیرانی سے پوچھ رہی ہیں کہ شرارت سے آنکھ مارنے والے ستارو! آخر تم کیا ہو؟ تو اے ٹوئنکل ٹوئنکل ٹمٹمانے ستارے تجھے تیرے قہر و غضب کی قسم ہے۔ ان معصوموں کے سوال کا جواب قیامت کی زبان سے نہ دینا.....

گڑیا فرش پر رینگ رہی تھی اور دادی رو رہی تھی۔ وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

"بس میری ایک آرزو ہے کہ جلد سے جلد یہ گڑیا لارا تک پہنچا دوں۔ ہائے وہ کتنی خوش ہوگی۔ کیا میں قیامت سے پہلے اسے ایک ننھی سی خوشی نہیں دے سکوں گی؟"

خورشید بلگرامی نے کہا۔ "میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔"

ہاتورا نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی بارہ بجنے والے ہیں۔ میرا خیال ہے ہم ایک بجے تک استنبول پہنچ جائیں گے۔"

جب گھڑی میں بارہ بجتے ہیں تو ایک بھی بجتا ہے۔ ایک کے بعد دو اور دو کے بعد تین بجنے لگے۔ مادام فلیچر گڑیا کو سینے سے لگائے سو گئی تھی۔ خورشید بلگرامی کی بھی آنکھ لگ گئی تھی مگر ہاتورا جاگ رہا تھا اور بار بار بے چینی سے گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔ ایرہوسٹس نظر نہیں آ رہی تھی ورنہ اس سے کچھ سوالات کرتا۔

ٹھیک چار بجے پائلٹ روم سے ہدایت کی گئی کہ وہ سیفٹی بیلٹ باندھ لیں۔ اسپیکر سے آنے والی آواز سن کر مادام اور خورشید بلگرامی کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ حیرانی سے گھڑی میں وقت دیکھنے کے بعد سیفٹی بیلٹ باندھ رہے تھے۔ بیس منٹ بعد طیارہ کسی رن وے پر دوڑتے دوڑتے ٹھہر گیا۔ جب اس کا دروازہ کھلا تو وہ تینوں مسافر سیڑھیاں اترتے ہوئے حیرانی سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ایرپورٹ کی عمارت بہت دور تھی اور مسلح فوجی قریب تھے۔ مادام نے زمین پر قدم رکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

ایک فوجی افسر نے جواب دیا۔ "آپ ہمارے ساتھ چلیں، ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

وہ تینوں مسلح جوانوں کے گھیرے میں چلنے لگے۔ ہاتورا نے پوچھا۔

"آفیسر! ایرپورٹ کی عمارت ادھر ہے، آپ ہمیں ادھر کہاں لے جا رہے ہیں؟"

آفیسر نے ریکارڈ کی طرح وہی جواب دیا۔ "آپ ہمارے ساتھ چلیں، ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

"ابھی معلوم ہو جائے گا تو پھر ابھی بتا دیجیے۔ میں آگے نہیں جاؤں گا۔"

وہ رک گیا۔ ایک فوجی جوان نے اسٹین گن کے دستے سے اسے دھکا دیا۔

"آگے بڑھو۔ نو آرگومنٹس....."

عالمی شہرت یافتہ ہاتورا یہ بے عزتی برداشت نہ کر سکا۔ اس نے جھلا کر پلٹتے ہوئے مسلح جوان کے منہ پر الٹا ہاتھ رسید کر دیا۔ پیچھے سے دو جوانوں نے اسے مضبوطی سے جکڑ لیا۔ آفیسر نے اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر کہا۔

"آپ معزز اور تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ کو لا اینڈ آرڈر کا پاس رکھنا چاہیے۔ بہتر ہے کہ آپ خاموشی سے چلیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ریوالور میں سائلنسر لگانے لگا۔ ہاتورا نے وحشت زدہ نظروں سے مادام اور خورشید بلگرامی کو دیکھا۔ خورشید بلگرامی نے سمجھایا۔

"مسٹر ہاتورا! مجبوری ہے، حالات سے سمجھوتہ کریں۔"

وہ چپ چاپ آگے بڑھنے لگا لیکن اسے اپنے اندر زلزلے کے جھٹکے لگ رہے تھے۔ نگاہوں کے سامنے اس کی محبوبہ اس کی بیوی سومنا کھڑی تھی اور ہاتھ اٹھا کر کہہ رہی تھی۔

"آگے نہ جاؤ۔ میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔"

"سومنا....." ہاتورا نے چیخ کر آواز دی۔ رات کے سناٹے میں دور تک آواز گونجنے لگی۔ "سومنا۔ نا۔ نا۔ نا....."

یکبارگی پنجرے کا پنچھی پھڑپھڑایا۔ پھر دو مسلح جوانوں کو دھکے دیتا ہوا ٹرمینل بلڈنگ کی طرف بھاگنے لگا اور چیخنے لگا۔

"میں آ رہا ہوں سومنا۔ نا۔ نا۔ نا....."

"ہالٹ!" آفیسر نے ریوالور کی نال سیدھی کی۔

"آفیسر! پلیز گولی نہ چلانا۔" خورشید بلگرامی نے آگے بڑھ کر کہا۔ تین مسلح جوان اسے پکڑ کر دھکیلتے ہوئے پیچھے لے گئے۔ اسی وقت ریوالور سے کھٹ کی آواز نکلی مگر نشانہ چوک گیا۔

وہ دیوانے کی طرح بھاگتا جا رہا تھا۔ آواز تھرتھراتی ہوئی

خود فراموشی پروفیسر ہوٹل میں مقیم تھا۔ چند روز بعد وہ ہوٹل چھوڑ گیا۔ اسٹیشن پر پہنچا تو اسے اچانک یاد آیا کہ اس کی چھتری تو ہوٹل کے کمرے ہی میں رہ گئی ہے چنانچہ وہ واپس پلٹا۔

اس وقت تک ہوٹل کا کمرہ دوسرے مسافر کو دیا جا چکا تھا۔ پروفیسر نے دروازہ کھولا تو اس کے کانوں میں کسی کی محبت بھری آواز آئی۔ "تم کس کی زندگی ہو؟ کیتھرین۔"

جواب میں ایک نسوانی آواز نے کہا۔ "تمہاری ہوں۔"

سوال کیا گیا۔ "یہ پیارے پیارے ہاتھ کس کے ہیں؟"

جواب ملا۔ "تمہارے ہی تو ہیں۔"

پوچھا گیا۔ "اور یہ سڈول بانہیں ـــ؟"

"تمہاری ہیں۔"

"اور یہ نشیلی آنکھیں؟"

"تمہاری ہیں، تمہاری ہیں۔" نسوانی آواز نے جواب دیا۔

"اور یہ ستواں ناک اور یہ ہونٹوں کی پنکھڑیاں اور یہ....."

"جب تم کونے میں رکھی ہوئی چھتری تک پہنچو۔" پروفیسر نے دروازے پر کھڑے کھڑے بات کاٹ کر کہا۔ "تو یاد رکھنا، وہ میری اور صرف میری ہے۔"

گونج رہی تھی۔ "سومنا۔ نا۔ نا۔ نا....."

"کھٹ....." دوسرا فائر ہوا۔ ہاتورا اچھل کر زمین پر گرا۔ پھر تڑپ کر بیٹھ گیا اور اپنی زخمی ٹانگ کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر زمین پر گھسٹتے ہوئے اپنی سومنا کی طرف جانے لگا۔

"میرا بچہ! میرا بیٹا!" مادام فلیچر تڑپ کر آگے بڑھی۔ آفیسر نے اس کے بوڑھے بازو کو تھام کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ روتی بلکتی ہوئی بولی۔ "جانے دو۔ میرے بیٹے کو جانے دو۔ وہ میری بہو سے ملنے جا رہا ہے۔ اسے جانے دو....."

آفیسر نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"مادام! ہوش میں آئیے۔ آپ سب ہماری دنیا کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ہم آپ کے محافظ ہیں۔ مسٹر ہاتورا کو صرف زخمی کیا گیا ہے۔ آپ اطمینان رکھیں ان کا توجہ سے علاج کیا جائیگا۔"

مادام نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ چار سپاہی ہاتورا کو اٹھا کر دور ایک ہیلی کوپٹر کی طرف لے جا رہے تھے۔ وہ دوڑتی ہوئی آ کر خورشید بلگرامی کے سینے سے لگ گئی۔ وہ زبان سے اسے تسلی نہ دے سکا۔ ہولے ہولے اسے تھپکنے لگا۔ آفیسر نے کہا۔

"مادام فلیچر اور مسٹر خورشید بلگرامی! اب میں بتا دوں کہ آپ لوگوں کو ہیلی کوپٹر کے ذریعہ جزیرہ باہاما میں پہنچایا جا رہا ہے جہاں گلوب آرک کی تعمیر شروع ہو چکی ہے۔ چار بڑے ممالک کے

درمیان سمجھوتہ ہو چکا ہے کہ ان ممالک کے تمام اہم فوجی افسران ۲۸ دسمبر کو خلائی اسٹیشنوں میں رہیں گے۔ طیاروں اور بحری جہازوں میں پناہ لیں گے۔ تمام حکمران طبقہ آبدوز کشتیوں میں قیامت کی گھڑیاں گزارے گا۔ اور آپ لوگوں کے لیے گلوب آرک تعمیر کیا جا رہا ہے۔ مادام! آپ کو آپ کی حکومت کے فیصلے کے مطابق حراست میں رکھا جا رہا ہے۔ مسٹر خورشید! ہم یہ نہیں چاہتے کہ آپ اور ہاتورا اپنے اپنے ملک واپس جا کر اپنی حکومت کو ہمارے مشن سے آگاہ کریں۔ آپ دونوں بھی باہاما جزیرہ میں مادام کے ساتھ رہیں گے اور ۲۸ دسمبر کو وہیں سے گلوب آرک میں سوار کرلیے جائیں گے۔ چلیں اب آگے بڑھیں۔"

مادام سر جھکا کر خورشید بلگرامی کے ساتھ ہیلی کوپٹر کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔ خورشید بلگرامی نے کہا۔

"مادام! آپ فکر نہ کریں۔ مغرب میں آپ کا بیٹا اور آپ کی بہو بخیریت ہیں۔ ہاتورا آپ کی مشرقی بہو سے ضرور ملے گا اور لارا آپ کی گردن میں ننھی باہنیں ڈال کر آپ کا منہ چومے گی۔"

مادام نے اسے پُرامید نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"کیا تم نے حساب کیا ہے؟ نیا زائچہ بنایا ہے؟"
خورشید بلگرامی نے جواب نہیں دیا۔ صرف دل میں کہا۔
"ہاں۔ امید کی تختی پر ایمان کے قلم سے محبت کا زائچہ بنایا ہے اور میرا ایمان ہے کہ قیامت ایک دن آئے گی، مگر محبتیں فنا نہیں ہوں گی۔"

جب قیامت کا ذکر چھڑ گیا ہے تو بات روپ وتی کی جوانی تک پہنچنی چاہیے۔

اس قیامت ڈھانے والی نے جب سے قیامت کا ذکر سنا تھا اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ اس کے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو گیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ گھر کی قیمتی چیزیں اٹھا کر پھینک دیتی تھی۔ یہ توڑ پھوڑ اس بے بسی کا مظاہرہ تھا کہ وہ آنے والی موت کا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔

خالقِ کائنات نے انسانوں کو سب کچھ دیا، صرف انہیں ان کی موت کا علم نہیں دیا کہ وہ کس دن اور کس گھڑی مریں گے۔ آنے والی قیامت کی بات الگ ہے۔ اگر ہر انسان کو اپنی موت کا ایک مقررہ وقت معلوم ہو جائے تو وہ وقت سے پہلے ہی مر جائے۔ جیسے روپ وتی اندر ہی اندر مر رہی تھی اور جیسے ابھی دنیا کے بے شمار لوگ دہشت سے پاگل ہو کر مرنے والے تھے۔

روپ وتی کے دل میں صرف ایک ہی امید کی کرن تھی کہ ہمت راؤ بچاؤ کی کوئی تدبیر کرکے واپس آئے گا۔ اس لیے وہ صرف شنکر کے سامنے خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتی تھی مگر تنہائی میں اس جذباتی نوجوان سے ملنے سے کتراتی تھی۔ اس نے بیماری کا بہانہ کرکے تمام شوٹنگ کی ڈیٹس کینسل کر دی تھیں۔ دو دنوں تک ہمت راؤ کا انتظار کرنے کے بعد اس نے اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ دیا۔ ایک پرانے ملازم کے ساتھ اپنے ایک پرائیویٹ کاٹیج میں آ گئی۔ شنکر سے جھوٹ کہہ دیا کہ وہ ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں اتر پردیش جا رہی ہے۔ اگر ہمت راؤ کی واپسی کی اطلاع ملے گی تو شنکر اس کے سیکرٹری کو بتائے گا۔ سیکرٹری اپنی مالکہ تک یہ خبر پہنچا دے گا۔

سب کچھ طے کرنے کے بعد وہ پرائیویٹ کاٹیج میں آئی تو تنہائی سے دل اور گھبرانے لگا۔ قیامت اور زیادہ یاد آنے لگی۔ اس نے چیختے ہوئے آرکسٹرا کے ریکارڈ لگائے۔ صبح شام بیئر اور وہسکی کے جام چڑھاتی رہی تاکہ آرکسٹرا کے شور میں اور نشہ کی بھول بھلیوں میں خود کو گم کر دے۔ لیکن دو ہی دن کے بعد وہ تھک گئی۔

چوتھا دن گزر گیا تھا اور ہمت راؤ واپس نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے دل کو بہلانے لگی کہ اپنے بچاؤ کا کوئی بہت بڑا منصوبہ بنایا جا رہا ہوگا اسی لیے واپسی میں دیر ہو رہی ہے مگر یہ انتظار کے دن کیسے گزریں گے؟ انتظار اس بات کا نہیں تھا کہ بوڑھا واپس ہوگا تو وہ فوراً ہی اس کے بیٹے کی دلہن بن جائے گی۔ انتظار اس بات کا تھا کہ وہ آئے اور اپنے بیٹے کے ساتھ بہو کو بھی کسی ایسی پناہ گاہ میں لے جائے جہاں قیامت اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

پانچویں دن اس کا دل ڈوبنے لگا۔ کوئی ایسا نہ تھا جس سے وہ باتیں کرکے دل بہلاتی۔ اس نے ملازم کو بلا کر کہا۔
"لطیف بابا! سامنے بیٹھو۔ تم مسلمان ہو نا؟"
"الحمد للہ مسلمان ہوں مالکن۔"
وہ جبراً ہنستی ہوئی بولی۔
"ارے مسلمان ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ قیامت تو ہندو مسلمان سب پر آئے گی۔"

ہنستے ہنستے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ہنسی کیوں اور روئی کیوں؟ آنسوؤں کو چھپانے کے لیے اس نے وہسکی کے جام کو منہ سے لگا لیا۔ لطیف بابا نے کہا۔
"ہاں مالکن! جب یہ زمین گناہوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکے گی تو قیامت سب پر آئے گی کیونکہ پاپ ہندو بھی کرتے ہیں اور مسلمان بھی۔"

"پاپ۔ گناہ" روپ وتی نے شیشے کے شفاف جام میں بکھرے کھاتی ہوئی سنہری شراب کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "بابا! سچی سچی بتاؤ تم نے کتنے گناہ کیے ہیں؟"

"کیا بتاؤں؟ جس بات سے شرم آتی ہو اسے نہ پوچھنا چاہیے نہ بتانا چاہیے۔"

وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو کر بولی۔

"تو پھر وہ کیا بھگوان ہے جو قیامت کے بعد شرم والی بات پوچھے گا اور ہمیں بتانے پر مجبور کرے گا؟"

"ایں۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں مالکن؟ ایسا کہنا بھی پاپ ہے۔"

وہ ایک سانس میں جام خالی کرنے کے بعد بولی۔

"ایسا کہنا بھی پاپ ہے، ایسا جینا بھی پاپ ہے، یہ شراب بھی پاپ ہے، یہ میرا شباب بھی پاپ ہے۔ اگر بھگوان مجھے یہ جوانی نہ دیتا تو اس کا کیا بگڑ جاتا۔ مجھے ایک معصوم بچی ہی رہنے دیتا تو یہ دنیا ایسی کالی نہ ہوتی، جیسا کہ میرا منہ کالا ہو گیا ہے۔"

وہ بوتل اٹھا کر خالی جام کو بھرتی ہوئی سر ہلا کر بولی۔

"ہاں ہاں۔ قیامت کے بعد بھگوان کو ضرور شرم والی بات پوچھنی چاہیے۔ وہ نہیں پوچھے گا تو ان شیطانوں کے چہرے بے نقاب نہیں ہوں گے جو آج نقاب پہنے فرشتہ نظر آتے ہیں۔ ہاں خدا کے سامنے اپنے اپنے کرتوتوں کا حساب ضرور ہونا چاہیے۔"

وہ پینے لگی۔ لطیف بابا نے کہا۔

"مالکن آپ بیٹھ جائیں۔"

"میرے ملازم اور میرا نمک کھانے والے رشتہ دار کہتے ہیں۔ بیٹی تھک گئی ہو بیٹھ جاؤ۔ میرے عاشق کہتے ہیں میری جان لیٹ جاؤ۔ ہاہاہا۔ میں تو اسی لیے پیدا ہوئی تھی کہ جو چاہے اٹھا دے، بٹھا دے اور لٹا دے۔ اگر قیامت سے پہلے بھگوان مجھ سے میری آخری خواہش پوچھے تو میں کہوں گی مجھے پھر سے ایک معصوم بچی بنا دو۔ جانتے ہو بابا کیوں؟

جب میں بچی تھی اور گھر والے اور محلے والے مجھے گود میں اٹھا کر پیار کرتے تھے تو مجھے کبھی اپنی سُندرتا (خوبصورتی) کا احساس نہیں ہوا۔ میں چاہتی تھی کہ ساری دنیا مجھے اسی طرح پیار کرتی رہے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسا ہوتا ہے کہ پیار کرنے والوں کا انداز رفتہ رفتہ بدلنے لگتا ہے اور اپنے انداز سے سمجھاتا ہے کہ اب تم بچی نہیں رہی ہو۔ ایک روز پڑوس کے چاچا جی نے میری سُندرتا کی تعریف کرتے ہوئے پیار کیا تو میں گھبرا گئی۔ اپنے آپ کو اس کے بازوؤں سے چھڑا کر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

جب وہ دوسرے کمرے میں آیا تو میں نے اسے گالی دی۔ وہ جلدی سے پلٹ کر بھاگ گیا۔ ہمارا کنبہ بہت بڑا ہے مگر اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اس وقت میں نہیں جانتی تھی کہ کس سازش کے تحت مجھے گھر میں تنہا چھوڑا گیا ہے۔ ماں مر چکی تھی۔ باپ شرابی تھا۔ بڑا بھائی بے کار تھا اور بھابھی سے طعنے سنتا تھا۔ بڑی بہن بیوہ تھی۔ دوسری جوان بہن اکثر سہیلی کے ہاں جانے کے لیے گھر سے نکلتی تھی اور واپسی میں کبھی راشن کے لیے اور کبھی گھر کے کرایہ کے لیے پیسے لایا کرتی تھی۔ چھوٹا بھائی جیب کترا تھا۔ ایسے ماحول میں میرا بچپن مجھ سے روٹھ گیا۔"

وہ شیشے کے جام سے بچپن کا ایک گھونٹ خالی کرتے ہوتے بولی۔

"شام کو بھابھی نے آکر غصے سے پوچھا۔ "کیوں رُوپا! تُو نے چاچا جی کو گالی دی ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں دی ہے۔ وہ چاچا نہیں شیطان ہے مجھے پیار کر رہا تھا۔"

"پیار کیا تو کیا ہوا؟ کیا چاچا کبھی ہمارے چولھے ہانڈی کے لیے کبھی تیرے باپو کے دارو کے لیے پیسے نہیں دیتا ہے۔"

"اے بھابھی! وہ پیسے دیتا ہے تو تم جا کے پیار کراؤ۔ مجھ سے ایسی باتیں کرو گی تو میں تمہارا منہ نوچ لوں گی۔"

وہ پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد منجھلی دیدی (بہن) آئی۔ اس نے پہلے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر مجھے گلے لگا کر بولی۔

"رُوپا! تو جوان کیوں ہو گئی؟ ہائے میری بہنا! میری طرح یہاں تیری زندگی بھی برباد ہو جائے گی۔"

دیدی کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ میرے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ میری بھلائی چاہنے والی بہن کی زندگی کس طرح برباد ہوئی ہے۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنی عزت بچانے کے لیے گھر سے بھاگ جاؤں میں نے بگڑ کر کہا۔

"دیدی! تمہیں شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے۔ لڑکیاں عزت کی خاطر گھر سے نہیں نکلتی ہیں اور تم مجھے گھر سے بھاگنے کے لیے کہہ رہی ہو۔"

"رُوپا! ہمارے دیس میں مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ گھروں میں رہنے والی بہنیں اور بیٹیاں سستی ہو گئی ہیں۔ اب گھر میں بھی عزت محفوظ نہیں رہتی۔ باہر نکلنے سے تقدیر اچھی ہو تو کوئی سہارا دینے والا مل جاتا ہے۔ میں جانتی ہوں ہماری گلی کا وِٹھل سوامی تجھے دیکھ کر آہیں بھرتا ہے۔ وہ جوان ہے۔ تجھے بھگا کر لے جائے گا۔ تو نہیں بھاگے گی تو باپو تیری شادی کبھی نہ ہونے دیں گے۔"

میرے باپو ایسے تو نہیں تھے۔ مجھے بہت چاہتے تھے۔ دیدی کی باتیں مجھے بہت بُری لگیں۔ میں نے جا کر باپو سے شکایت کر دی۔ باپو نے دیدی کو بہت باتیں سنائیں۔ بھیا نے انہیں کمرے میں بند کر کے ان کی خوب پٹائی کی۔ کیونکہ وہ نافرمان بیٹی باپ کی برائی کرتی تھی۔ باپو نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میری بیٹی! بہت اچھی بہت سُندر ہے۔ باپ کا کہنا مانتی ہے۔ میں ابھی اپنی بیٹی کو سرکس دکھلانے لے جاؤں گا۔ بہو! ادھر آؤ۔ رُوپا کا اچھی طرح سنگار کر دو، اور اسے وہ بنارسی ساڑھی پہنا دینا۔ میری رُوپا بالکل دلہن لگے گی۔"

روپ وتی شیشے کے جام کو دیکھنے لگی۔ مرکری ٹیوب کی روشنی میں اس کی ہرنی جیسی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ زہریلے انداز میں مسکراتی ہوئی بولی۔

"ہائے رے میرا بھولا پن۔ میں بہن کو دشمن اور قصائی کو باپ سمجھ رہی تھی۔ ہاہاہا۔۔۔"

وہ ایک قدم آگے بڑھتی ہوئی لڑکھڑائی۔ پھر نشہ میں ڈگمگانے لگی۔ لطیف بابا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر عاجزی سے کہا۔

"بس کریں مالکن! اب بوتل بند کر دیں۔"

"نہیں۔۔۔" اس نے کھینچتے ہوئے شیشے کا جام کھینچ کر لطیف بابا کے منہ پر مارا۔ نشہ میں نشانہ چوک گیا۔ جام پچھلی دیوار سے ٹکرا کر چور چور ہو گیا۔ روپ وتی نے ڈگمگاتے ہوئے اپنی انگلی اٹھا کر بابا سے کہا۔

"اے بڈھے! ابھی قیامت آرہی ہے۔ بوتل کیسے بند ہو گی۔ ابھی تو حساب کھلے گا۔ دیکھ تو ادھر کھڑا ہو جا۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ ہر گھڑی ہو جاتی۔۔۔ ہوں۔ اب قیامت آگئی ہے تار۔۔۔ ارے تو میرا بھگوان ہے اور میں پاپن میں فلمی طوائف اپنا اعمال نامہ پیش کر رہی ہوں۔ یس ریڈی۔ اسٹارٹ ساؤنڈ۔ کیمرہ۔ کلیپ۔ بھگوان کا کلوز اپ۔۔۔۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میرا باپو مجھے ایک ڈاک بنگلہ میں لے گیا کہنے لگا۔ یہاں کمرے میں بیٹھو یہاں سے ہم گاڑی میں بیٹھ کر سرکس دیکھنے جائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک موٹی توند والا سیٹھ کمرے میں آیا۔ وہ دروازے کو اندر سے بند کرنے لگا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"تم کون ہو؟ میرے باپو کہاں ہیں؟"

"میں نے اسے پانچ سو روپے اور ٹھرے کی ایک بوتل دی ہے۔ اسے بھول جاؤ۔"

اس نے مجھے کھینچ کر سینے سے لگانا چاہا۔ میں نے ایک زور کا تھپڑ مارا۔ وہ پیچھے ہٹا۔ پھر آگے بڑھا۔ میں کمرے میں ادھر سے ادھر بھاگنے لگی۔ میرے آگے پیچھے اس کی توند بل رہی تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ پھر میری بنارسی ساڑھی کا پلو اس کے ہاتھ آگیا۔ وہ میری ساڑھی کھینچنے لگا۔ جب ساڑھی کھینچی جاتی ہے تو پہننے والی گول چکر میں گھوم جاتی ہے۔ چکرا جاتی ہے۔

میں بچپن سے گیتا کا پاٹھ کرتی تھی۔ وہ میرے دھرم کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں بھی یہی لکھا ہے کہ مرد مجبور ہو کر عورت کو بیچ دیتا ہے۔ پانڈو بھائیوں نے اپنی مشترکہ بیوی دروپدی کو جوئے میں ہارا تھا۔ میرا باپ مہنگائی اور مجبوری کی بساط پر مجھے ہار رہا تھا۔ جیتنے والے دروپدی کی ساڑھی کھول رہے تھے۔ کرشن بھگوان ساڑھی کے پیچ کو بڑھاتے جا رہے تھے تاکہ دروپدی بے لباس نہ ہو۔ وہ سیٹھ میری ساڑھی کے پیچ کھول رہا تھا۔ بھگوان اس وقت تم کہاں تھے؟

"آں" لطیف بابا نے بوکھلا کر کہا۔ "مجھے معاف کر دو مالکن۔ میں آپ کا بھگوان نہیں بن سکتا۔"

"کیسے نہیں بن سکتا۔ تمہارا تو باپ بھی بنے گا۔ قیامت کے دن حساب کھل رہا ہے تو تم انصاف سے کترا رہے ہو۔ بولو کیا میں گنگا جل کی طرح پوتر (پاکیزہ) نہیں تھی؟ مجھے پاپ کا راستہ کس نے دکھایا؟

میں تھال میں تلسی کے پتے، گیندے کے پھول اور پرشاد رکھ کر تمہاری پوجا کے لیے مندر آتی تھی تو پھر تمہاری دھرتی کے لوگ مجھے پوجا کے پرشاد کی طرح بانٹ کر کیوں کھاتے رہے؟

یہ کہاں کا دستور ہے کہ عورت چپ چاپ لٹتی رہے تو بیماری کا گھر بن جائے اور ڈنکے کی چوٹ پر لوٹنے کے ہتھکنڈے سیکھ لے تو طوائف کہلائے۔ بولو بھگوان میرے اعمال نامے میں تم میرا کیا نام لکھو گے؟

نہیں بولو گے؟ ہاں کیسے بولو گے۔ تم بھی مرد ہو۔ اگر کوئی عورت بھگوان ہوتی تو ابھی میرے سارے پاپ دُھل جاتے۔ اور وہ مجھے بیٹی کہہ کر سینے سے لگا لیتی۔"

اس کی شرابی آنکھیں یک بیک آنسوؤں سے بھر گئیں۔ لطیف بابا نے تڑپ کر کہا۔

"اگر انصاف میرے ہاتھ میں ہے تو میں تمہیں بے گناہ کہتا ہوں میری بچی، میری بیٹی۔۔۔"

"خبردار!" وہ لڑکھڑا کر پیچھے گئی۔ پھر تنبیہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر بولی۔

"خبردار۔ مجھے بیٹی نہ کہنا۔ باپ اور بیٹی کا رشتہ میرے لیے گالی بن گیا ہے۔ مجھے اس دنیا کے تمام بوڑھوں سے نفرت ہے۔ نفرت ہے۔۔۔"

وہ دانت پیستی ہوئی لطیف بابا کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے

پہنچنے میں مزید آدھ گھنٹہ لگ جاتا۔ اس وقت تک باپ بیٹے ایئرپورٹ سے واپس آجاتے۔ اس لیے اس نے شنکر کی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر ٹیکسی واپس کر دی۔

ملازم نے اس کے لیے کوٹھی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "صاحب واپس آتے ہی ہوں گے۔"

روپ وتی نے اسے دس کا ایک نوٹ دے کر کہا۔ "صاحب کو یہ نہ بتانا کہ میں ان کے کمرے میں موجود ہوں۔"

ملازم راضی ہو گیا۔ وہ شنکر کے کمرے میں آگئی۔ اس نے نوجوان عاشق کو بہلانے کا طریقہ سوچ لیا تھا کہ وہ پردے کے پیچھے چھپ جائے گی۔ جب وہ کمرے میں آئے گا تو پیچھے سے آکر وہ اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھے گی۔ شنکر اس کی اس ادا سے خوش ہو کر اسے اپنی آغوش میں کھینچ لے گا۔ اس کے بعد وہ اپنے مطلب کی بات شروع کرے گی۔

روپ وتی سے بہت دور ایئرپورٹ کے لگیج ہال کے سامنے باپ بیٹے کا سامنا ہو گیا۔ ہمت راؤ اسے دیکھتے ہی ٹھٹھک گیا۔ اسے یوں لگا جیسے سامنے شنکر نہیں بلدیو کھڑا ہے۔ پھر خیالوں میں لیشیا منہ چڑانے لگی۔ "ادھر بڑے آئے میرے بچے کے باپ بننے والے۔ ذرا بلدیو کو دیکھو وہ ہے شنکر کا باپ..."

شنکر آگے بڑھ کر ہمت راؤ کے گلے لگ گیا۔ "پتا جی! کیا بات ہے، آپ مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہو رہے ہیں؟"

وہ جبراً مسکرا کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "بیٹے! میں تھک گیا ہوں اور خوشی تو چہرے پر نہیں ہوتی دل میں ہوتی ہے۔ تمہیں دیکھ کر دل پر کیا گزر رہی ہے یہ تو میں ہی جانتا ہوں۔ کم آن مائی سن! ڈرائیو کرو۔"

وہ دونوں کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ شنکر نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"آپ دو دن کے لیے گئے تھے۔ ایک ہفتہ کیوں لگ گیا؟"

"اہم معاملات اتنی آسانی سے نمٹائے نہیں جاتے۔ میں گھر پہنچ کر تمہیں بتاؤں گا۔ اس وقت مجھے وہسکی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں تاکہ شنکر مخاطب نہ کرے۔ وہ آج صبح میونخ سے دہلی پہنچا تھا۔ وہاں اس نے وزیرِ خارجہ کو رپورٹ پیش کی تھی اور وہ چھوٹی سی رپورٹ یہ تھی کہ تمام سائنس داں اور ماہرینِ فلکیات اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ دُمدار ستارہ زمین سے ٹکرائے گا۔ چند دنوں کے بعد وہ ستارہ اپنا راستہ بدل کر دوسری طرف نکل جائے گا۔ فی الحال پریشانی کی بات نہیں ہے۔ لیکن اس ستارے پر ہمہ وقت نظر رکھنا ضروری ہے اس مقصد کے لیے اسے گرین وچ کی آبزرویٹری میں دوبارہ بلایا گیا ہے۔

وزیرِ خارجہ نے کہا۔ "دو بڑے ممالک نے ہم سے درخواست کی ہے کہ وہ آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہمارے دیس کے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ آپ کل ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں۔"

اپنی حکومت کے سامنے ہمت راؤ کا جھوٹ نبھ گیا کیونکہ اس کی پشت پر بڑے ممالک تھے۔ اب بیٹے سے جھوٹ بولنے کی باری تھی۔ ابھی وہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ اس کا انتقامی جذبہ بولتا تھا کہ وہ بلدیو کا بیٹا ہے۔ اسے سچی بات بتا کر قیامت کی دہشت میں مبتلا رکھنا چاہیے یا پھر اس سے کہنا چاہیے کہ قیامت سے بچنے کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کو اس پناہ گاہ میں لے جائے گا لیکن بیٹا اپنی روپ وتی کو نہیں لے جا سکے گا۔

"ہاں یہ تدبیر اچھی ہے۔ یہ بناسپتی بیٹا اپنی جان بچانے کیلئے روپ وتی سے منہ موڑ لے گا۔ میں اس بیٹے کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ پھر یہ یہاں رہ کر روپ وتی کو منہ نہیں دکھا سکے گا۔ سالے کی ماں نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ وہ اور اس کا یار اپنی محبت کی نشانی میرے پاس چھوڑ گئے ہیں۔ جیسے اتنی بڑی دنیا میں میں ہی ایک اُلّو ہوں۔ اُف مجھے نہیں سوچنا چاہیے۔ سوچنے سے غصہ آتا ہے۔ غصہ آنے سے ابھی شنکر کے سامنے کام بگڑ جائے گا۔ اس کی ماں نے جیسے مسکرا مسکرا کر مجھے فریب دیا تھا مجھے بھی اسی طرح مسکرا کر اس کے بیٹے کو اُلّو بنانا چاہیے۔"

گھر پہنچ کر شنکر نے کہا۔ "پتا جی! یونیڈ وہسکی۔ میرے کمرے میں آیئے بہترین وہسکی ہے۔"

اس نے بیٹے کے کمرے میں آکر بظاہر باپ بننے کا فرض ادا کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ اس عمر میں بیئر سے آگے نہ بڑھو۔ مگر تم نے وہسکی پینا شروع کر دی۔"

شنکر نے شیوازا ایگل کی بوتل نکال کر ایک پیگ بناتے ہوئے کہا۔

"بس یہی ایک بوتل ہے۔ آپ کولر میں جھانک کر دیکھ لیں۔ باقی سب بیئر کی بوتلیں ہیں۔ یہ لیجیے ایک سانس میں خالی کیجیے پھر بتایئے کہ دُمدار ستارے سے بچنے کی امید ہے یا نہیں؟"

ہمت راؤ اپنا جام لے کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ شنکر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"میرے کمرے میں یہ خوشبو کیسی ہے۔ یہ خوشبو تو روپ وتی لگاتی ہے۔"

اس نے کمرے کا دروازہ کھول کر ملازم سے پوچھا۔ ملازم نے کہا۔ "صاحب وہ آتی ہوں گی میں نے نہیں دیکھا۔"

ملازم جھوٹ بول کر چلا گیا۔ ہمت راؤ نے آدھا پیگ حلق سے اتارنے کے بعد کہا۔

"تمہیں روپ وتی سپنے میں بھی نظر آتی ہے۔ مگر بیٹے، قیامت

تمام بوڑھوں کی ہڈیاں چبا رہی ہو۔ پھر وہ پلٹ کر لڑکھڑاتی اور ڈگمگاتی ہوئی پلنگ کے سرہانے والی میز کے پاس گئی اور وہاں وہسکی کی بوتل کی گردن کو مٹھی میں جکڑ کر بولی۔

"میں کس کس کی گردن پکڑوں؟ کس سے جا کر کہوں کہ مجھے اے کلاس طوائف بنا لیا ہے تو اب قیامت کے عذاب سے بھی بچاؤ۔"

اس نے بوتل کو منہ سے لگایا۔ پھر ایک گھونٹ پی کر انکار میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔

"میں نہیں مروں گی۔ قیامت! تو آتی ہے تو آ۔ پر اپنی جوانی کی قسم میں نہیں مروں گی کیونکہ جب میں ڈاک بنگلے سے نکل کر مرنا چاہتی تھی تو سیٹھ نے کہا تم تو مر چکی ہو۔ کیا مرنے کے لیے اور بھی کچھ رہ گیا ہے؟

میں نے گھر پہنچ کر خودکشی کرنی چاہی تو بابو، بھیا اور بھابی میرے قدموں میں گر پڑے کیونکہ اس روز میں پانچ سو روپے گھر لائی تھی۔ دیدی دور کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے دُکھ سے کہا۔ "روپیا! آتما ہتیا (خودکشی) بیکار ہے۔ تو مرنے گئی تھی مر گئی۔ اب صرف تیری جوانی زندہ رہے گی۔"

پھر میں جہاں گئی سب نے یہی کہا کہ رُوپیا مر گئی۔ روپ وتی زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ میں ایک قیامت ہوں جو فنا ہونے کے لیے، فنا کرنے کے لیے اس دنیا میں آئی ہے۔

تو پھر میرے ہوتے ہوئے یہ آسمان سے دوسری قیامت کیوں آرہی ہے؟ ایک دھرتی پر دو قیامتیں برپا نہیں ہو سکتیں۔ میرے عاشقوں نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا ہے کہ مجھ سے بڑی قیامت کوئی نہیں ہے اور انہوں نے یہ ثابت بھی کیا ہے۔ یہاں سے وہاں تک لاکھوں کروڑوں گھروں میں جھانک کر دیکھ لو۔ تمہیں بھگوان کی مورتی اور اللہ رسولؐ کے طغرے اتنے نظر نہیں آئیں گے جتنی کہ میری ہیجان انگیز تصویریں دکھائی دیں گی۔

"اب میں اتنی اونچی اتنی مہنگی ہوں کہ لوگ اب صرف میری تصویروں کو اپنی خواب گاہوں میں لے جا سکتے ہیں۔ یہ مہنگی زندگی میں نے بڑے مہنگے داموں حاصل کی ہے اس لیے میں آسانی سے نہیں مروں گی۔

دنیا والوں نے مجھے زندہ رہنے کے لیے جتنے ہتھکنڈے سکھائے ہیں، میں وہ سارے ہتھکنڈے آنے والی قیامت کو ٹالنے کے لیے آزماؤں گی۔ اگر لوہے سے لوہا کٹتا ہے تو یہ قیامت اُس قیامت کو کاٹے گی۔"

اس نے بوتل کو منہ سے لگانے کے لیے سر کو اٹھایا تو پیچھے کی طرف لڑکھڑاتی ہوئی بستر پر گر ہی۔ نشہ نے اسے چاروں شانے چت کر دیا۔ کھلی ہوئی بوتل کی گردن اس کے سینے کی مغرور بلندیوں کے درمیان دھنس کر شراب اگلنے لگی۔ جیسے بچپن نے اس کے کورے بدن میں جوانی اگلی تھی، جیسے ایک بوڑھے دلال نے اس کی جوانی میں گاہک لگائے تھے اور جیسے عاشق نما گاہکوں نے اپنے وجود کی گالیاں اس کے وجود میں اگلی تھیں۔ بس اسی طرح وہ بوتل شراب اگل رہی تھی اور اس کی چولی بھگو رہی تھی۔ کرشن کنہائی ہولی کی رنگ بھری پچکاریاں چھوڑ رہے تھے۔ رادھا کی چولی بھیگ رہی تھی۔ کرشن بھگوان کے نقشِ قدم پر چلنے کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ جذبات کی ہولی میں عورت کی چولی شراب سے بھگوئی جائے۔

وہ بھیگ رہی تھی اور مدہوشی کی گود میں سو رہی تھی۔

چھ دن کے جان لیوا انتظار کے بعد ساتویں دن ۱۱ اگست کی دوپہر کو سیکرٹری نے اطلاع دی کہ ہمت راؤ آج شام سات بجے کی فلائیٹ سے یہاں پہنچنے والا ہے۔ روپ وتی نے اپنے سیکرٹری سے کہا۔

"تم شنکر سے جا کر کہو کہ تم نے مجھے دہلی ٹرنک کال کیا تھا۔ یہ بتلا کر میں وہاں سے روانہ ہو چکی ہوں اور یہاں مدراس پہنچنے والی ہوں تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ میں واقعی اتر پردیش سے آج شام یہاں آئی ہوں۔"

سیکرٹری واپس چلا گیا۔ روپ وتی نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر مدراس کے سب سے نامور ہیئر ڈریسر کو کال کیا کیونکہ آج اسے خوب بن سنور کر اپنے حسن کی انتہا تک پہنچ کر شنکر کو بہلانا تھا تاکہ اس کے باپ بچاؤ کی جو تدبیر بیٹے کو بتائے: بیٹا اسے اپنی محبوبہ سے نہ چھپائے۔ دنیا داروں پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔ پتہ نہیں کب باپ بیٹے دھوکا دے جائیں۔ اس لیے وہ فریب زدہ عورت پہلے ہی انہیں فریب دینے کے جال بُن لینا چاہتی تھی۔

جب وہ چھ بجے بن سنور کر قیامت بن گئی تو ڈرائیور نے آکر کہا۔

"مالکن! کار خراب ہو گئی۔"

"کیسے خراب ہو گئی؟" اس کا موڈ بگڑ گیا۔ "بیٹھے بیٹھے حرام کی کھاتے ہو۔ کیا تمہیں نہیں بتایا تھا کہ مجھے ضروری کام سے شنکر کی کوٹھی میں ابھی پہنچنا ہے۔ منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جلدی سے جا کر ٹیکسی لے آؤ۔"

ڈرائیور بھاگتا چلا گیا۔ روپ وتی نے آئینہ میں دیکھا تو چہرے پر غصہ تھا جبکہ آج اسے مسکرانے کی ریہرسل کرتے ہوئے شنکر کے پاس پہنچنا تھا۔ وہ جبراً مسکرانے لگی۔ آدھ گھنٹے بعد ٹیکسی آئی تو پھر اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ وہ شنکر کی کوٹھی کی طرف جاتی ہوئی سوچ رہی تھی کہ اب وہ کوٹھی میں نہیں ملے گا۔ سات بجنے والے تھے۔ ایئرپورٹ

سے بچنے کے لیے تمہیں روپ وتی کو یہاں چھوڑ کر جانا ہوگا۔"

شنکر نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ نے تو اس سے جلد از جلد شادی کرنے کے لیے کہا تھا۔"

"ہاں کہا تھا مگر سمے بدلتا ہے تو بات بھی بدل جاتی ہے۔ دیکھو بیٹے! دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کو بچانے کے لیے بڑے ہی خفیہ طور سے ایک ایسا گلوب آرک بنایا جا رہا ہے جس میں پناہ لینے کے بعد دُمدار ستارے سے بچنے کے لیے نوّے فیصد امکانات ہیں ان بڑے لوگوں کی فہرست میں میرا نام بھی ہے ہمیں سختی سے منع کیا گیا ہے کہ ہم اپنے خون کے رشتوں کو بھی یہ راز نہ بتائیں۔"

وہ پینے لگا۔ شنکر نے پوچھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بڑے لوگ اپنے خون کے رشتوں کو چھوڑ کر جائیں گے؟"

"مجبوری ہے۔ سیاہی ویس کی ہکشا (حفاظت) کے لیے خون کے رشتوں کو چھوڑ کر جاتے ہیں۔ ہم اس تباہ ہونے والی دنیا کے بعد ایک نئی دنیا آباد کرنے کے نیک ارادے سے جائیں گے۔ اچھے کاموں کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں مگر تم چنتا (فکر) نہ کرو، میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"میں روپ وتی کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"پاگل نہ بنو۔ یہ محبت نہیں حماقت ہے۔ ہم سب سے کہا گیا ہے کہ ہم نئی دنیا کو آباد کرنے کے لیے اپنے ساتھ صرف ایک عورت گلوب آرک میں لے جا سکتے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ میرے ساتھ عورت نہیں میرا بیٹا آئے گا۔ تم ہی سوچو کہ میں بھی شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں کسی کو دھرم پتنی بنا کر اپنے ساتھ لیجا سکتا تھا۔ لیکن تم مجھے عزیز ہو۔ اور تم ہو کہ باپ کی محبت ٹھکرا کر ایک فلم ایکٹریس کے ساتھ یہاں مرنا چاہتے ہو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "پتاجی! آپ مجھے امتحان میں نہ ڈالیں۔ روپ وتی نے میرے ساتھ مرنے جینے کی قسم کھائی ہے۔ میں بھی اسے وچن دیا ہوا وچن نبا ہوں گا۔ یہ اچھا ہوگا کہ آپ فوراً شادی کرلیں اور میری نئی ماتاجی کے ساتھ نئی دنیا کی طرف چلے جائیں۔"

ہمت راؤ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر غصے سے کہا۔

"جب تم میرا مشورہ نہیں مانتے ہو تو مجھے مشورہ دینے کا تمہیں کوئی ادھیکار نہیں ہے۔"

وہ وہسکی کی بوتل اٹھا کر جانے لگا۔ شنکر نے اسے آواز دی "پتاجی! سنیے تو سہی۔۔۔!"

وہ دروازے سے پلٹ کر بولا۔ "میں نے تمہیں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ کل صبح تک تم اپنا فیصلہ سنا دو۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اب مجھے آرام کرنے دو۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ شنکر اپنے کمرے میں پریشانی سے ٹہلنے لگا۔ پریشانی فیصلہ کرنے کی نہیں تھی۔ فیصلہ تو وہ سچے دل سے کر چکا تھا کہ روپ وتی کے ساتھ قیامت کا سامنا کرے گا۔ پریشانی اس بات کی تھی کہ وہ باپ کو سلامتی کے ساتھ نئی دنیا کی طرف رخصت کرتے وقت اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کمرے میں ٹہلتے رہنے سے کوئی بات نہیں بن سکتی تھی۔ گرمی اتنی تھی کہ دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ پہلے غسل کرے گا، پھر ٹھنڈی بیئر پیتے ہوئے باپ کو منانے کی کوئی تدبیر سوچے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ تولیہ اٹھا کر باتھ روم میں چلا گیا۔

باتھ روم کا دروازہ بند ہوا تو کمرے کے دوسرے دروازے کا پردہ سرک گیا۔ روپ وتی نے کان لگا کر سنا۔ باتھ روم کے شاور سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اطمینان سے چلتی ہوئی پلنگ کے سرہانے والی میز کے پاس آئی۔ وہاں ایک فریم میں شنکر کی تصویر مسکرا رہی تھی۔

ایک لمحہ کے لیے تصویر بدل گئی۔ اب روپ وتی کے سامنے وِٹھل سوامی مسکرا رہا تھا۔ رو پا جب کنواری کنیا تھی تو اس کی دیدی نے سمجھایا تھا کہ اس گھر میں تیری عزت محفوظ نہیں رہے گی۔ تو وِٹھل سوامی کے ساتھ بھاگ جا۔ وہ جوان ہے تیری پوجا کرتا ہے۔ تجھے عزت سے رکھے گا۔

مگر اس نے دیدی کی بات نہیں مانی۔ باپو کے ساتھ ڈاک بنگلے چلی گئی۔ پھر وہاں سے زندگی کا بھیانک سرکس دیکھ کر واپس آئی تو اسے عقل آگئی تھی۔ دوسری رات وہ وِٹھل سوامی کے ساتھ بھاگ گئی۔

"وِٹھل سوامی! میرے پہلے عاشق! تم مجھے دل و جان سے چاہتے تھے۔ جیسا کہ ابھی شنکر مجھے چاہتا ہے، تم اپنے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر کلکتہ آگئے۔ تم نے مجھے بہت سا پیار دیا اور اعتماد پیدا کیا کہ عورت کو سچا سہارا مل جائے تو وہ ایک ہی سہاگ کے قدموں میں جیون بتا کر اپنی چتا تک جاتی ہے۔

مگر ایک دن تمہارے ماں باپ پہنچ گئے۔ باپ نے تمہیں سفید بالوں کا واسطہ دیا۔ ماں نے اپنی ساڑھی کا آنچل تمہارے قدموں میں بچھا دیا تاکہ تم مجھے چھوڑ کر ان کے ساتھ واپس جاؤ۔ وہ کہتے تھے کہ میری ایک بہن پیشہ کرتی ہے۔ باپ شرابی ہے۔ بھائی جیب کترا ہے۔ اگر ایک بدکار گھرانے کی لڑکی ان کی بہو بن کر آئے گی تو تمہاری جوان بہن کی ڈولی اٹھانے کوئی نہیں آئے گا۔

تم الجھن میں پڑ گئے۔ جیسا کہ ابھی شنکر الجھ رہا ہے۔ ماں باپ اپنا فیصلہ سنا کر چلے گئے کہ صبح تک تم اپنا فیصلہ سناؤ۔ جیسا کہ شنکر کی زندگی میں بھی کل فیصلہ کی صبح آنے والی ہے۔ وہ میری نادانی کی عمر تھی۔ میں تم پر بھروسہ کرکے سو گئی۔ تم جوان بہن کی ڈولی اٹھانے اور باپ کے سفید بالوں کی لاج رکھنے کے لیے مجھے سوتے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ نہ سوچا کہ میری لاج سوناگاچی کے چکلے میں پہنچ جائے گی۔"

وہ ایک لمحہ گزر گیا۔ اب نگاہوں کے سامنے وِٹھل سوامی نہیں تھا۔ میز پر شنکر راؤ کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ باتھ روم کے شاور سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ روپ وتی کی آنکھیں شنکر کی تصویر سے کہہ رہی تھیں۔

"شنکر! میرے پچیسویں سلور جوبلی عاشق! فیصلہ کی رات کڑی ہوتی ہے۔ یہ رات عورت کو سکھا دیتی ہے کہ اگر وہ سو گئی، اس کی عقل اور اس کی تدبیر سو گئی تو تقدیر بھی سو جائے گی۔ ہر انسان کے ساتھ اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ وِٹھل سوامی اپنی بہن کی ڈولی اٹھانے پر مجبور تھا۔ اس کی طرح تم ابھی مجھ پر دل و جان سے عاشق ہو مگر صبح ہونے تک تمہیں اپنے باپ کی بائیس سالہ محبتیں یاد آئیں گی کہ کس طرح اس نے تمہیں اپنے بازوؤں میں کھلایا، گود میں سلایا۔ تمہارے لیے اس نے اب تک دوسری شادی نہیں کی۔ تمہاری خاطر وہ گلوب آرک میں اپنے ساتھ کسی عورت کو نہیں لے جائے گا۔ تب تمہیں شرم آئے گی کہ تم باپ کو بڑھاپے میں آخری وقت صرف روپ وتی کے لیے چھوڑ رہے ہو۔

تم بھی مجبور ہو جاؤ گے۔ میں بھی مجبور ہوں کہ دنیا نے جو مکر و فریب مجھے سکھایا ہے، وہی میں دنیا والوں پر آزما رہی ہوں۔ اس سے پہلے کہ تمہارا فیصلہ بدلے۔ اس سے پہلے کہ تمہیں اپنے بوڑھے باپ کے سفید بالوں کا خیال آئے، میں ابھی جا کر ان بالوں میں جوانی کا خضاب لگاؤں گی۔۔۔"

یہ سوچ کر وہ دروازے کی طرف پلٹ گئی۔ پھر دانت پیس کر بولی۔ "بڈھے! اے۔۔۔!" اس کے بعد وہ کمرے کا دروازہ بند کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔

ہمت راؤ اپنے کمرے میں ایک آرام دہ صوفہ پر بیٹھا دوسرے پیگ کا پہلا گھونٹ حلق سے اتار رہا تھا۔ اتنے میں خوشبو کا ایک جھونکا آیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے روپ وتی جوانی کی پہلی دستک کی طرح بوڑھے دروازے سے لگی کھڑی تھی۔

بوڑھے ہاتھ میں ساغر لرز گیا۔ ساغر کی چھاتی میں شراب لرز گئی۔ شراب کی تلچھٹ میں نشے کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ یعنی شراب کو بھی نشہ آتا تھا جب وہ آتی تھی۔

"اونہہ!" ہمت راؤ نے دل ہی دل میں ناگواری سے "اونہہ"

اس لیے کی کہ وہ شنکر کی محبوبہ تھی۔ بھٹک کر شاید ادھر آگئی تھی۔ ورنہ جوان بازوؤں کی بیل پر چڑھے ہوئے انگور کہاں ہاتھ آتے ہیں۔ انھیں کھٹا سمجھ کر بڑھاپے میں کراہنا پڑتا ہے "اونہہ!"

اس نے منہ گھما کر ساغر سے ایک چسکی لی۔ جدھر منہ گھمایا ادھر قدِ آدم آئینہ تھا۔ آئینہ میں وہ نظر آ رہی تھی۔ سنہرے بارڈر کی جامنی ساڑھی میں ننھے ننھے سنہری ستارے چمک رہے تھے۔ بدن کی اٹھان پر ابھر رہے تھے اور بدن کی ڈھلان میں ڈوب رہے تھے۔ دیکھنے والی آنکھوں کو جگہ جگہ سے آنکھ مار رہے تھے۔ ہمت راؤ نے جلدی سے آنکھ بند کرلی۔ پھر خیال آیا کہ آنکھ بند کرنے سے اپنی کمزوری ظاہر ہوگی۔ اس نے جلدی سے آنکھ کھول کر میز پر سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا۔ اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر لائٹر کو تلاش کیا جو چند لمحے پہلے میز پر تھا۔

اب وہ لائٹر گلابی ہتھیلی کے کنول پر تھا۔ ہمت راؤ نے ذرا ہمت سے کام لے کر نظریں اٹھائیں۔ وہ گلابی گلابی مکھڑا نگاہوں کے بالکل قریب تھا۔ فاصلہ اتنا ذرا سا تھا کہ اور ذرا سے ذرا ہو سکتا تھا۔ وہ اس کے سامنے فرش پر دوزانو ہو گئی۔ ساڑھی کا آنچل شانہ سے ڈھلک گیا تھا۔ ہمت راؤ کے ہونٹوں میں سگریٹ کانپنے لگا۔ وہ سگریٹ لائٹر کے شعلہ پر نہیں ٹھہر رہا تھا۔ کبھی لڑکھڑا کر شعلہ کے دائیں جا رہا تھا، کبھی بہک کر شعلہ کے بائیں آ رہا تھا۔ آخر اس نے انگلیوں سے سگریٹ کو تھام کر ایک کش لیا تو زور کی کھانسی آگئی۔

"کھوں کھوں، تم شاید شنکر کا۔۔۔ کھوں کھوں۔۔۔ کمرہ سمجھ کر یہاں آئی ہو کھوں کھوں۔۔۔!"

"نہیں میں شنکر کے باپ کو دیکھ کر آئی ہوں۔ ایک بات بولتی ہوں۔ برا نہ ماننا۔ تم شنکر کے باپ نہیں ہو۔"

پہلے کھانسی کے جھٹکے تھے۔ اب دماغ کو جھٹکا پہنچا۔ اس نے چونک کر روپ وتی کو دیکھا۔ یہ بھید اسے کیسے معلوم ہو گیا؟ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات کسی کو معلوم ہو۔ اس طرح اس کی مردانگی کو ٹھیس پہنچتی تھی کہ وہ اپنی بیوی کے بیٹے کا باپ نہیں ہے۔

وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ "تت۔۔۔ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تم ایسے جوان اور صحت مند ہو کہ تیس برس سے زیادہ کے نہیں لگتے۔ پھر بائیس برس کے بیٹے کے باپ کیسے ہو سکتے ہو؟"

ہمت راؤ خوش ہو گیا۔ اس کی بتیسی نکل گئی۔ سامنے قدِ آدم آئینہ بھی اسے جوان کہہ رہا تھا۔ ایک حسین اور جوان عورت کی

زبان بھی تصدیق کر رہی تھی۔ ایسے وقت مرد کی سمجھ میں نہیں آتا کہ عورت سے زیادہ آئینہ جھوٹ بولتا ہے یا آئینہ سے زیادہ عورت جھوٹ بولتی ہے۔ اس نے ذرا خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا تو تم مجھ سے مذاق کرنے آئی ہو؟"

"نہیں سچ بولتی ہوں۔ اس روز تم ویس سے باہر جا رہے تھے۔ تم سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ایئرپورٹ جانے کے لیے میں تمہارے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تو ایسا لگا۔ ایسا لگا۔۔۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی کہ کیسا لگا؟ مگر ہمت راؤ کو اس کی بات اچھی لگ رہی تھی۔ اسے یاد آیا۔ روپ وتی نے اسے سوٹ میں دیکھ کر کہا تھا۔

"واقعی آپ بوڑھے نہیں لگتے۔ اس سوٹ میں کتنے ینگ اور اسمارٹ لگ رہے ہیں۔۔۔"

ایک ہفتہ پہلے کی وہ بات یاد آگئی تو اس نے خوش ہو کر وہسکی کا ایک لمبا گھونٹ حلق سے اتارا۔ روپ وتی نے سر جھکا کر کہا۔

"میں تم سے ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں مگر یہاں نہیں، یہاں شنکر آجائے گا۔"

ہمت راؤ نے بیٹھے بیٹھے جھوم کر اسے دیکھا۔ وہ ایسی بھرپور تھی کہ ایک نظر میں پوری کی پوری نظر نہیں آتی تھی۔ اسے سر سے پاؤں تک الگ الگ دیکھنے اور ہجے کرنے کے بعد ایک مجسم حسن کی پہچان ہوتی تھی۔ تب ہمت راؤ نے سوچا کہ بلڈ یوک بیٹے سے کچھ چھین لینے کا وقت یہی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ ڈگمگاتے ہوئے، دروازے کے پاس آکر اسے اندر سے بند کیا۔ پھر پلٹ کر بولا۔

"اب یہاں شنکر کا باپ بھی نہیں آئے گا۔ بولو کیا بولتی ہو؟"

"آواز باہر جائے گی۔" وہ فرش سے اٹھ کر اٹھلاتی ہوئی کمرے کے وسط میں آکر کھڑی ہوگئی۔

ہمت راؤ نے ریکارڈ پلیئر کو آن کرنے کے بعد کہا۔

"اب ہماری آواز باہر نہیں جائے گی۔"

کمرے میں آرکسٹرا کی آواز چکرانے لگی۔ ہمت راؤ کا سر بھی چکرانے لگا کیونکہ وہ انگڑائی لے رہی تھی۔

"میں نے شنکر کو کبھی پیار نہیں کیا۔ وہ صرف میری فلم کا پروڈیوسر ہے۔ اس کی زبان سے تمہاری تعریفیں سن کر میں تمہیں دیکھنے کے لیے بے چین ہوگئی اور جب تمہیں پہلی بار دیکھا تو میرے دل نے کہا مجھے تمہاری ہی تلاش تھی۔ تم جو ساری دنیا میں شہرت رکھتے ہو۔ زندگی کی اونچ نیچ کا تجربہ کر چکے ہو۔ آج کل کے نوجوانوں کی طرح اناڑی نہیں ہو۔ تم سچ مچ میری قدر کرو گے۔"

ہمت راؤ نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"تم نے میرے بارے میں ٹھیک سوچا۔ میں ہمیشہ تمہاری قدر کروں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے گورے گورے ہاتھ کو چومنے کے لیے سر جھکایا۔ روپ وتی نے اپنا ہاتھ اوپر جھکا دیا۔ اس کا سر اور جھک گیا۔ اس وقت تک اس کا گورا چکنا ہاتھ بوڑھی گرفت سے پھسل کر آزاد ہو چکا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی۔

"تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ شنکر شادی کے لیے کہتا تھا اور میں ٹال دیتی تھی۔"

"ہاں اب تو سب کچھ یاد آرہا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تم شروع ہی سے مجھے چاہنے لگی تھیں۔"

وہ دونوں بازو پھیلا کر اس کے گداز بازوؤں تک پہنچا۔ پھولوں سے لدی ہوئی شاخ لچک گئی۔ بل کھا کر گھوم گئی۔ ہمت راؤ کے ہاتھ میں صرف ساڑھی کا آنچل آیا۔ وہ آنچل کھینچ نہیں سکتا تھا کیونکہ ساڑھی ایک بروچ کے ذریعہ بلاؤز سے منسلک تھی۔ وہ دروپدی کی ساڑھی کی طرح آسانی سے کھل نہیں سکتی تھی۔

"جب تم میری محبت کو مانتے ہو تو پہلے اپنی محبت کا یقین دلاؤ کہ میرے ساتھ جیو گے اور میرے ساتھ مرو گے؟"

"ہاں میں تمہارے ساتھ جینے اور مرنے کا وچن دیتا ہوں۔"

"قیامت آرہی ہو تب بھی وچن نبھا ہوگے؟"

"آں؟" وہ گڑبڑا گیا۔ قیامت واقعی آنے والی تھی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے بھول گیا تھا کہ اسے اپنے بچاؤ کے لیے تنہا گلوب آرک میں جانا ہے۔ مگر اب وہ تنہا کیوں جائے؟ روپ وتی جیسی قیامت اس کے ساتھ ہوگی تو قیامت کے دن قیامت کا ہنی مون ہوگا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ "قیامت کی بات سن کر تم چپ کیوں ہوگئے؟"

"اس لیے کہ سچ مچ قیامت آنے والی ہے۔ اٹھائیس دسمبر کو ایک دمدار ستارہ ہماری دھرتی سے ٹکرانے والا ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔ شنکر نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"اوہ اچھا۔ مگر تم یہ نہیں جانتیں کہ اس قیامت سے صرف میں ہی تمہیں بچا سکتا ہوں۔"

"میں یہ بھی جانتی ہوں۔ کیا تھوڑی دیر پہلے شنکر کے کمرے میں تمہیں میری خوشبو نہیں ملی تھی؟"

ہمت راؤ نے اسے حیرانی سے دیکھ کر کہا۔

"اوہ تم تو بڑی چالاک ہو۔"

"چالاک تم بھی ہو۔ مجھے وچن دے رہے تھے اور قیامت کا راز چھپا رہے تھے۔"

یہ کہہ کر وہ ایک دم قریب آگئی۔ پھر اس کی گردن میں گداز باہوں کا ہار پہنا کر بولی۔

"ایک ساتھ مرنے کی قسم کھانا حماقت ہے۔ تم مجھے چاہتے ہو، اور میں اپنی سلامتی چاہتی ہوں۔ اس لیے ایک ساتھ گلوب آرک میں جینے کی قسم کھاؤ۔"

جوان سانسیں بوڑھی سانسوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ ہانپتے کانپتے بولا۔

"ہاں ضرور۔ ہاں قسم کھاتا ہوں۔ تمہیں اپنے ساتھ گلوب آرک میں لے جاؤں گا۔"

اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ روپ وتی کی پشت پر آئے۔ بلاؤز کی زپ تک پہنچے۔ مگر وہ زپ کو اوپر سے نیچے نہ لا سکا۔ روپ وتی نے زپ کے پیچھے ایک ہک لگا رکھا تھا۔ جب تک وہ ہک اپنی جگہ سے نہ ہٹتا، زپ اپنی جگہ سے نہ سرکتی۔ یہ بات ہمت راؤ کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ اس لیے وہ ایک اناڑی کی طرح زپ کو جھٹکے دیتا رہا۔

"ہمت راؤ! تھک جاؤ گے۔ یہ اس رُوپا کا لباس نہیں ہے جو کئی بار ہوس کے ڈاک بنگلوں میں کھل چکا ہے۔ ایک ایک سمے نے ایک ایک طمانچہ میرے منہ پر مار کر سکھا دیا ہے کہ مجھے اپنے لباس کو کس طرح گلوب آرک بنانا چاہیے۔ تاکہ اس دنیا کا کوئی دمدار ستارہ میری مرضی کے بغیر قیامت نہ ڈھا سکے۔ ہاتھ وہاں سے ہٹا لو، اور میری بات غور سے سنو۔

سودے کے اصولوں پر سودا ہوگا۔ اس ہاتھ دو اور اُس ہاتھ لو۔ پہلے تم مجھے اپنے ساتھ یہاں سے لے چلو۔ میرے نام سے گلوب آرک میں داخلے کے کاغذات مکمل کراؤ۔ پھر میں گلوب آرک کی اپنی پہلی رات تمہارے نام کر دوں گی۔"

یہ کہتے ہی وہ اس سے الگ ہوگئی۔ ہمت راؤ نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"یہ۔۔۔ روپ وتی! یہ ظلم ہے۔ صرف سودے بازی نہیں محبت بھی ہونی چاہیے۔"

"میں محبت ہی کر رہی ہوں۔ دیکھو میں نے اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھوں میں دیا ہے۔ میں تمہیں پیار بھی کروں گی۔ تمہیں پیاس لگے گی، وہسکی پلاؤں گی۔ نیند آئے گی سر سہلا کر سلا دوں گی۔ میں تمہاری داسی بن سکتی ہوں مگر گلوب آرک میں جانے سے پہلے باسی نہیں بن سکتی۔"

وہ حسرت سے اس کے گورے گورے ہاتھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

"اچھی بات ہے۔ پھر اپنے ہاتھوں سے وہسکی ہی پلا دو۔"

دوسرے کمرے میں شنکر بیئر پی رہا تھا۔ وہ پیتے پیتے صبح کر دینا چاہتا تھا۔ اس امید پر کہ شاید صبح تک باپ کو راضی کرنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں آجائے۔ ہماری دنیا میں یہی ہوتا ہے۔ ایک کی تدبیر کو دوسرے کی تدبیر کاٹتی ہے اور اس کا جو نتیجہ ہمارے سامنے آتا ہے اسے ہم تقدیر کہتے ہیں۔ کل جب شنکر ایک محبوبہ کی بے وفائی اور ایک باپ کے سفید خون کا تماشہ دیکھے گا تو اسے تقدیر کا لکھا ہوا المیہ ڈرامہ سمجھ کر آنسو بہائے گا۔

رات کے ایک بجے شنکر نے کوٹھی کے باہر کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ اس نے کمرے سے نکل کر ملازم کو آواز دی۔ وہ باہر تھا۔ دوڑتا ہوا آیا۔ شنکر نے پوچھا۔

"کیا پتاجی کہیں باہر گئے ہیں؟"

"جی صاحب وہ شریمتی جی کو چھوڑنے گئے ہیں۔"

"کون شریمتی؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہی صاحب شریمتی روپ وتی۔ وہ تو یہاں بہت دیر سے آئی تھیں۔ بڑے صاحب کے کمرے میں تھیں۔"

"کیا بکتے ہو؟ روپ وتی ہوتی تو میرے کمرے میں آتی۔ تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو۔"

"میں جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ جب بڑے صاحب آپ سے باتیں کر کے اپنے کمرے میں گئے تو تھوڑی دیر بعد شریمتی بھی آپ کے کمرے سے نکل کر بڑے صاحب کے کمرے میں چلی گئیں۔"

"روپ وتی میرے کمرے سے نکل کر۔۔۔" وہ بولتے بولتے رک گیا۔ اسے یاد آیا کہ باپ سے باتیں کرتے وقت کمرے میں ایسی خوشبو تھی جو روپ وتی کی یاد دلاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کمرے میں چھپی ہوئی تھی اور ان کی باتیں سنتی رہی تھی۔

وہ مسکراتا ہوا اور سوچتا ہوا کمرے میں آیا۔ "میری جان! تمہیں اپنی زندگی سے کتنا پیار ہے۔ شریر کہیں کی۔ ہماری باتیں چھپ کر سن رہی تھی۔ اب پتاجی کو اس وقت سے منا رہی ہوگی کہ بیٹے کے ساتھ ہونے والی بہو کو بھی گلوب آرک میں لے چلیں۔"

وہ سوچتا ہوا بستر پر آکر بیٹھ گیا۔ سرہانے کی میز پر اس کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ اس نے تصویر کے فریم کو پلٹ دیا۔ فریم کے پیچھے روپ وتی کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ وہ تصویر کو لے کر بستر پر لیٹ گیا۔ پھر اس سے کہنے لگا۔

"روپا! پتاجی میری بات نہیں مانتے، تمہاری کیا مانیں گے۔ ان کی ضد ہے کہ میں ان کے ساتھ جاؤں اور میری ضد ہے کہ تمہارے ساتھ یہاں مر جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم مرنا پسند نہیں کرتیں مگر اس وقت میرے ساتھ قیامت کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جاؤ گی جب بچاؤ کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ پتاجی مجھ سے مایوس ہو کر یا تو تنہا گلوب آرک میں جائیں گے یا پھر کسی کو اپنی دھرم پتنی بنا کر لے جائیں گے۔ تم ہونے والی بہو ہو۔ تمہیں تو وہ اپنے ساتھ لے جا نہیں سکتے۔"

اس نے تصویر کو سینے سے لگا لیا۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ ۲۸ دسمبر کو روپ وتی اس کے ساتھ قیامت کی گھڑیاں گزارے گی۔

دوسری صبح ہمت راؤ نے شنکر سے کہا۔

"روپ وتی آئی تھی اور مجھ سے التجائیں کر رہی تھی کہ میں تمہارے ساتھ اسے بھی گلوب آرک میں لے چلوں مگر میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں اپنے ساتھ کسی ایک کو لے جا سکتا ہوں۔ میں شنکر کو لے جانا چاہتا ہوں۔ وہ تمہیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا اس لیے تم دونوں ساتھ رہو میں کسی اور کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"پتاجی! کسی اور کا مطلب یہ ہے کہ آپ شادی کر رہے ہیں؟"

"آج شام کو میں جا رہا ہوں۔ شادی کرنے کا وقت نہیں ہے اس لیے کسی کو فرینڈ بنا کر لے جاؤں گا۔ وہاں جا کر کورٹ میرج کر لوں گا۔"

"پتاجی! آپ نے تو خوش کر دیا۔ جلدی سے بتائیے وہ خوش نصیب کون ہے جو میری ممی بننے والی ہے؟"

"بیٹے! وہ اتنی سندر ہے کہ اسے دیکھتے ہی تمہارا دل باغ باغ ہو جائے گا۔ لیکن وہ نہیں چاہتی کہ شادی سے پہلے کوئی اُسے میرے ساتھ دیکھے۔ میں نے بہت کہا کہ کم از کم میرے بیٹے سے مل لو، مگر وہ بہت شرمیلی ہے۔ تم سے بھی ملنا نہیں چاہتی۔"

"یہ شرمانے والی بات تو اچھی نہیں ہے۔ میں شریمتی کو ضرور دیکھوں گا۔"

"بیٹے! گڑبڑ ہو جائے گی۔ تم زبردستی دیکھنے کی ضد کرو گے تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ ہم جرمنی پہنچ کر جس روز شادی کریں گے اس روز تمہیں ضرور وہاں بلائیں گے۔"

"اوہ پتاجی! پتہ نہیں وہ کون سا قیامت کا دن ہوگا کہ میں جرمنی جا کر انہیں دیکھوں گا۔ نہیں، کچھ بھی ہو چاہے چھپ کر دیکھنا پڑے، میں ایئرپورٹ پر کسی طرح انہیں دیکھ لوں گا۔"

"کیسے دیکھو گے؟"

"میں آپ کے ساتھ ایئرپورٹ نہیں جاؤں گا کیونکہ یہ ہماری آخری ملاقات نہیں۔ ہم پھر ایک بار جرمنی میں ملیں گے۔ لہٰذا میں یہیں آپ سے رخصت ہو جاؤں گا۔ پھر روپ وتی کے ساتھ ایئرپورٹ جاؤں گا۔ جب آپ شریمتی کے ساتھ طیارے کی طرف جا رہے ہوں گے تو ہم ٹرمینل بلڈنگ کے ٹیرس پر کھڑے رہیں گے۔ میں روپ وتی کو دوربین سے دکھاؤں گا کہ دیکھو ہونے والی بہو، میرے پتاجی کے ساتھ تمہاری ہونے والی ساس جا رہی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ پھر وہ روپ وتی کے ساتھ شام کا پروگرام بنانے کے لیے اس کی کوٹھی کی طرف چلا گیا۔ ہمت راؤ مسکرا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ پشپا اور بلدیو اپنے بیٹے کو میری گود میں ڈال کر ساری زندگی مسکراتے رہے۔ اب ان کا بیٹا تڑپے گا تو ان دونوں کی آتمائیں بھی تڑپنے لگیں گی۔ آہ! میرے کلیجے میں کیسی ٹھنڈک پہنچ رہی ہے۔

شنکر اپنی محبوبہ کی کوٹھی میں پہنچا تو پتہ چلا کہ آج وہ صبح سے شاپنگ میں مصروف ہے کہیں جانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ وہ اسے تلاش کرنے کے لیے بازاروں کے چکر لگانے لگا۔ مدراس کوئی چھوٹا سا شہر نہیں ہے کہ وہ کسی ایک شاپنگ سینٹر میں نظر آجاتی۔ تقریباً چار گیلن پٹرول پھونکنے کے بعد وہ شام کو گھر واپس آیا تو پتہ چلا کہ ہمت راؤ ایئرپورٹ جا چکا ہے۔ اس نے روپ وتی کو فون کیا۔ اس کے گھر سے جواب ملا کہ وہ اپنے ساتھ دو بڑے بڑے سوٹ کیس لے کر کہیں گئی ہے۔ گھر والوں کو اس نے کچھ نہیں بتایا ہے۔ اس کے ساتھ اتنا سامان دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ لمبے سفر پر جا رہی ہے۔

شنکر ریسیور رکھ کر سوچنے لگا کہ آخر وہ کہاں جا سکتی ہے؟ وہ بڑی آرام طلب تھی۔ کار یا ٹرین کے ذریعہ سفر نہیں کرتی تھی لہٰذا اس وقت وہ ایئرپورٹ ہی جا سکتی تھی۔ یہ سوچ کر وہ بھی کار ڈرائیو کرتا ہوا ایئرپورٹ پہنچ گیا۔ فلائیٹ کا وقت ہو چکا تھا۔ اب وی آئی پی روم میں ہمت راؤ سے ملاقات نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ دوربین لے کر سیدھا ٹیرس پر چلا گیا۔ کتنے ہی مسافر طیارے کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے دوربین کو آنکھوں سے لگا کر دیکھا۔ جانے والوں کی پشت نظر آرہی تھیں۔ بائیس برس کے تعلقات ایسے ہوتے ہیں کہ اپنوں کو پیچھے سے بھی پہچان لیا جاتا ہے۔

اس نے اپنے پتاجی کو پیچھے سے پہچان لیا لیکن باپ کے ساتھ جو چل رہی تھی۔ اس کی پشت اور اس کا پہناوا دیکھ کر اچانک اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اسے اپنی دوربین پر یقین نہ آیا کہ وہ صحیح تماشہ دکھا رہی ہے۔ اس نے آنکھوں سے دوربین ہٹا کر دیکھا۔ پھر دوربین لگا کر دیکھا حالانکہ زہریلی سچائی کو دوربین لگا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس نے تو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا لیکن دل نہیں مان رہا تھا اس لیے پہچان کر بھی نہیں پہچان رہا تھا۔

وہ دونوں چند قدم آگے بڑھ کر رک گئے۔ پھر پلٹ کر ٹیرس کی جانب دیکھنے لگے کیونکہ ہمت راؤ پہلے ہی سے جانتا تھا کہ شنکر ٹیرس پر موجود ہوگا۔ پلٹ کر دیکھنے کے باعث روپ وتی کا چہرہ دوربین کی آنکھوں میں واضح طور سے مسکرانے لگا۔ وہ اتنی زیادہ خوشی سے کھلی جا رہی تھی جیسے قیامت کو شکست دے کر ابھی سے نئی دنیا کی زمینیں اپنے نام سے الاٹ کرا لی ہوں۔

شنکر کے ہاتھوں سے دوربین چھوٹ کر گردن سے جھول گئی۔ اس کے دماغ کو ایسا شدید جھٹکا پہنچا تھا کہ سامنے کی ہر چیز گھومتی نظر آرہی تھی۔ وہ دونوں رخصت ہونے کے لیے اُس کی طرف ہاتھ ہلا رہے تھے۔ وہ ہلتے ہوتے ہاتھ جیسے طمانچے مار رہے تھے۔ بعض سچائیاں طمانچے مارتی ہیں تب بھی یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ وہ سچ ہے۔ حالانکہ اس کے دماغ کو جھٹکا پہنچا تھا اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا، پھر بھی وہ اندر سے چیخ رہا تھا کہ اس کی جاگتی آنکھوں کے سامنے ایک مضحکہ خیز سپنا ہے۔

پتہ نہیں چلا کہ وہ دونوں کب نگاہوں سے دور ہوئے اور طیارے میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہاں جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہونے تو شنکر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "پتاجی! پتاجی! آپ تو میرے لیے کھلونے خرید کر لاتے تھے۔ آج چھین کر کیسے لے جا رہے ہیں؟ پتاجی! میں آپ کو پتاجی کیسے کہوں؟"

طیارہ پرواز کے لیے پر تولنے لگا۔ زمین سے یوں اٹھتے لگا جیسے دل سے درد اٹھتا ہے۔ ہمت راؤ اور روپ وتی کی پرواز بہت اونچی تھی اور شنکر زمین کی پستی میں تھا۔ جب آنسو بھری آنکھوں سے طیارہ اوجھل ہونے لگا تو اس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر جوڑ دیئے۔ پھر روتے ہوئے کہا۔

"نئی ماتاجی پرنام ...!"

⁂

دمدار ستارے کی یقینی آمد کو عوام سے یوں چھپایا گیا تھا، جیسے کوئی محبوبہ ناجائز ملاقات کے لیے آرہی ہو۔ لیکن ان حالات میں اکثر یوں ہوتا ہے کہ آنے والی تھم تھم کر آتی ہے اور پاؤں کی چھاگل سہم سہم کر بجتی ہے۔ اسی طرح بات سہم سہم کر آگے بڑھ رہی تھی۔

راز کبھی جان بوجھ کر زبان سے نہیں نکلتا۔ مجبوری میں ایسا ہوتا ہے کہ کوئی محبت سے مجبور ہو کر اپنی محبوبہ سے کہہ دیتا ہے۔ محبوبہ وعدہ کرتی ہے کہ وہ کسی سے نہیں کہے گی مگر اپنا پیٹ ہلکا کرنے کے لیے دیوار سے کہتی ہے۔ دیوار کے دوسری طرف پڑوسن سن لیتی ہے۔ پھر وہ پڑوسن اپنی پڑوسن کو سناتی ہے۔ دنیا کے اہم ترین راز جو مردوں کے دل میں تھے، وہ عورتوں کی زبان پر آکر ننگے ہوتے رہے اور یہ راز عورتوں کی زبان تک پہنچانے والے مرد ہی ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ایک ماہ کے اندر ہی سڑکوں اور بازاروں کی فضا رازدارانہ سرگوشیوں سے بھر گئی تھی۔ لوگ کچھ کہہ رہے تھے، کچھ سن رہے تھے اور کچھ سمجھ رہے تھے۔ لیکن جو کچھ سمجھ رہے تھے، اس کی تصدیق نہیں ہو رہی تھی۔ معلومات کے ذرائع جیسے نابود ہو گئے تھے پھر یہ بات کھٹکنے لگی کہ پریس، ریڈیو، ٹیلیویژن اور نشرواشاعت کے تمام اہم شعبوں پر سنسر کا پہرہ کیوں بٹھایا گیا ہے۔

بظاہر حقیقت تو چھپ جاتی ہے مگر اخبارات جو اخباری اشارے کرتے ہیں وہ اشارے عوام کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرنے لگتے ہیں۔ رفتہ رفتہ دو ماہ بعد سیاست کی فضا بدل گئی۔ تمام ممالک کی خارجہ پالیسیوں میں حیرت انگیز تبدیلیاں ہونے لگیں۔ تمام بڑی طاقتیں آپس کی دشمنی کو بالائے طاق رکھ کر دوستانہ معاہدے کر رہی تھیں۔ پھر بھی عوام یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ قیامت قریب ہے۔ اور بڑے ممالک صرف دو ماہ ستائیس دنوں کے لیے ایک دوسرے کو تیسری جنگ عظیم کی دھمکی نہیں دے سکتے تھے۔ اب وہ آپس میں متحد ہو کر صرف گلوب آرک جیسے منصوبے ہی بنا سکتے تھے۔

تمام چھوٹے اور ترقی پذیر ممالک کی حوصلہ افزائی اور اُن کی ترقی کے لیے بڑے ممالک فراخدلی دکھا رہے تھے اور تحریری معاہدے کر رہے تھے کہ چھوٹے ممالک کی زرعی اور صنعتی ترقی کے لیے بڑی بڑی رقمیں بغیر سُود کے قرض دیں گے۔ قرض دینے کی تاریخ ۲۸ دسمبر تھی۔ شاعروں نے ایسی ہی ادا کو قیامت کا وعدہ کہا ہے۔

باہاما جزیرے میں فنِ تعمیر سے تعلق رکھنے والے انجینئروں اور مزدوروں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ جزیرے کے جنوبی ساحل پر گلوب آرک بڑی تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہا تھا۔ لوگ دن رات کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ وہاں رات کو بھی دن کا سماں ہوتا تھا۔ ہزاروں کینڈل پاور کے بڑے بڑے ہیڈ لائٹس روشن رہتے تھے۔ کام کرنے والوں کے لیے ہر وقت ڈائننگ ہال اور شراب خانہ کھلا رہتا تھا۔ وہ لوگ مفت کھاتے تھے، مفت پیتے تھے اور بھاری معاوضہ پر ایک اہم منصوبہ کی تکمیل میں مصروف رہتے تھے۔

وہاں سے ایک میل کے فاصلہ پر بہت سے کاٹیج بنے ہوتے تھے۔ ایک کاٹیج کے تین کمروں میں ہاتورا، مادام فلیچر اور خورشید بلگرامی نظربند کیے گئے تھے۔ وہاں انہیں زندگی کی تمام سہولتیں میسر تھیں۔ وہ کاٹیج کے وسیع باغیچہ میں چہل قدمی کر سکتے تھے لیکن اس سے آگے نہیں جا سکتے تھے اور نہ ہی کسی انجینئر یا مزدور سے باتیں کر سکتے تھے۔ وہاں کے مزدور اس بات سے بے خبر تھے کہ وہ گلوب آرک کس مقصد کے تحت بنایا جا رہا ہے۔ کاٹیج کے چاروں طرف مسلح فوجی پہرہ دیتے رہتے تھے۔

ہاتورا کی ٹانگ کا زخم بھر گیا تھا۔ اب وہ ذرا لنگڑا کر چلتا تھا۔ مادام جب سے وہاں پہنچی تھی، بستر پر بیمار پڑی ہوئی تھی۔ اس کا باقاعدہ علاج ہو رہا تھا۔ دوائیں کھلائی جا رہی تھیں مگر دل کا زخم نہیں بھر رہا تھا۔ وہ بستر پر کروٹ بدل کر بار بار کھڑکی کی سلاخوں کے اس پار دیکھتی تھی۔ دور بہت دور ایک سو آٹھ فٹ اونچا گلوب آرک نظر آتا تھا اور خاموشی سے دھمکیاں دیتا تھا کہ اُسے اپنی مٹھی میں جکڑ کر اس کی پوتی لارا سے دور لے جائے گا۔ خورشید بلگرامی اسے تسلیاں دیتا تھا۔

"مادام! یہ فکر اور پریشانیاں آپ کو اپنے بیٹے، بہو اور پوتی تک نہیں پہنچا ئیں گی۔ یہاں انسان بہت کچھ سوچتا ہے اور بہت کچھ کرتا ہے مگر ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔ خدا کو منظور ہوگا تو آپ اپنے گھر کی جنت میں ضرور پہنچیں گی۔"

بعض لوگ دوسروں کو تسلیاں دینے کے عادی ہوتے ہیں خورشید بلگرامی نے بھی اپنی عادت کے مطابق ایک بار تسلی دی۔ پھر اسے خیال آیا کہ مادام کوئی عام سی عورت تو نہیں ہے کہ تسلیوں سے بہل جائے گی۔ اس بوڑھی عورت نے یقیناً اپنی ہتھیلی کے آئینے میں اپنے مستقبل کو پڑھ لیا ہوگا جن کے آگے مستقبل کی بشارت ہوتی ہے انہیں کوئی تسلی نہیں دے سکتا۔

مادام اور خورشید بلگرامی غیب کی باتیں نہیں جانتے تھے کیونکہ عالم الغیب صرف خداوند کریم ہے۔ البتہ ان کا علم جس حد تک انہیں مستقبل کے اشارے دیتا تھا۔ اس حد تک وہ اپنے سامنے اپنے مستقبل کا ہلکا سا خاکہ کھینچ چکے تھے۔ صرف ہاتورا بے خبر تھا اور اپنے نجومی ساتھیوں کو اپنا ہاتھ دکھاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا کہ کہیں وہ یہ نہ کہہ دیں کہ اس کی سومنا اسے نہیں ملے گی۔

اور دو ماہ گزر گئے۔ ۱۵ دسمبر کو گلوب آرک مکمل ہو گیا اسی رات سے مزدوروں کو واپس بھیجا جانے لگا۔ جزیرہ غیر ضروری لوگوں سے خالی کیا جا رہا تھا۔ اور ضروری لوگ ہیلی کوپٹر کے ذریعہ وہاں پہنچ رہے تھے۔ ہر دو گھنٹے بعد ایک مال بردار اور مسافر بردار ہیلی کوپٹر آتا تھا۔ ان اہم مسافروں میں ہمت راؤ اور روپ وتی بھی تھے۔ تمام اہم افراد کے لیے الگ الگ کاٹیج مخصوص کیے گئے تھے۔ ان لوگوں کی آمد سے جزیرے میں جیسے بہار آ گئی کیونکہ ان کے ساتھ دنیا کی حسین ترین عورتیں تھیں۔

ہمت راؤ ہیلی کوپٹر سے اترنے کے بعد روپ وتی کے ساتھ اپنے کاٹیج کی طرف جا رہا تھا۔ ایک نمبر کاٹیج کے قریب سے گزرتے وقت روپ وتی ذرا رک گئی۔ کاٹیج کے اطراف مسلح فوجی کھڑے ہوئے تھے۔ باغیچہ میں خورشید بلگرامی اور ہاتورا کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ روپ وتی نے پوچھا۔

"یہ لوگ کون ہیں؟"

ایسا پوچھتے وقت وہ خورشید بلگرامی کو بڑی تفصیل سے دیکھ رہی تھی۔ کسی میں کوئی بات ہوتی ہے تب ہی عورت اسے دیکھتی ہے اور خود کو نہیں بتا سکتی کہ یوں دیکھتی کیوں چلی جاتی ہے۔ ہمت راؤ نے خورشید بلگرامی کو دیکھا تو وی آئی پی لاؤنج کا وہ انجینئر یاد آ گیا جس نے اپنے ہاتھ کی لکیریں دکھائی تھیں اور ایک منٹ کے بعد ہی خون تھوک کر مر گیا تھا۔ اس نے خورشید بلگرامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ جس کی سنہری داڑھی ہے وہ ایک مسلمان پامسٹ خورشید بلگرامی ہے۔ تم اسے کبھی اپنا ہاتھ نہ دکھانا اور کبھی اپنے جنم دن کی تاریخ بتانا۔ وہ بہت خطرناک ہے۔ چلو آگے بڑھو۔"

وہ آگے بڑھتی ہوئی بولی۔ "وہ خطرناک کیسے ہے؟ کیا ہاتھ دیکھنے سے ہاتھ کاٹ لیتا ہے؟"

"نہیں باقی زندگی کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ بڑی منحوس زبان ہے اس کی۔ کمبخت جو کہتا ہے جو بولتا ہے وہی ہوتا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" روپ وتی نے سوچا۔ میں اپنی مدبھری آنکھوں سے جو سمجھاتی ہوں اور اداؤں کی زبان سے جو بولتی ہوں وہ ہوتا ہے۔ اس سنسار کی سب سے بڑی نجومی صرف حسین عورت ہوتی ہے جس کی مٹھی میں مرد کا مستقبل ہوتا ہے۔"

روپ وتی نے چلتے چلتے پلٹ کر دور کھڑے ہوئے خورشید بلگرامی کو دیکھا۔ ایک ادائے ناز سے مسکرائی۔ پھر گھوم کر ہمت راؤ کے ساتھ چلی گئی۔ خورشید بلگرامی اس سے بے خبر ہاتورا سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ ہاتورا کے دل اور دماغ میں صرف اس کی سومنا تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"مسٹر خورشید! آج ۱۶ دسمبر ہے۔ ۲۸ دسمبر کا منحوس دن دیکھتے ہی دیکھتے قریب آتا جا رہا ہے۔ کیا میں اپنی سومنا سے نہیں مل سکوں گا۔ پلیز آپ ذرا پھر ایک بار حساب کریں۔ ہو سکتا ہے کہ دُمدار ستارے کا راستہ بدل گیا ہو۔"

"میں کئی بار حساب کر چکا ہوں۔ وہ ستارہ راستہ نہیں بدلے گا۔ وہ اپنے مقررہ وقت پر ہماری زمین سے ضرور ٹکرائے گا۔"

"لارا۔۔۔" اچانک ہی مادام نلیچر کی چیخیں سنائی دیں وہ اپنی پوتی کو پکار رہی تھی۔ وہ دونوں دوڑتے ہوئے اس کے کمرے میں پہنچے مادام بستر سے اٹھ کر کاٹیج سے باہر آنا چاہتی تھی مگر نقاہت کے باعث کمرے کے دروازے پر گر پڑی۔ خورشید بلگرامی نے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا اس کا بدن بخار سے پھنک رہا تھا۔ وہ نقاہت سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے جانے دو۔ جب مجھے مرنا ہی ہے تو میں فرار ہونے کی کوشش کرتی ہوئی مروں گی۔ آخری وقت یہ اطمینان تو ہوگا کہ میں لارا کے پاس پہنچتے پہنچتے مر رہی ہوں۔ کہاں ہے وہ گڑیا؟ میری لارا کی گڑیا کہاں ہے؟ مجھے دو۔ میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

خورشید بلگرامی نے اسے بستر پر لٹا کر کہا۔

"مادام! میں آپ کو گڑیا لا کر دیتا ہوں۔ پہلے آپ خود کو سنبھالیں۔ ابھی آپ کے سامنے گڑیا آئے گی۔ ابھی لارا آپ کو نظم سنائے گی۔ ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار۔ یاد آئی۔۔۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ کیونکہ مادام بیہوش ہو چکی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا باہر گیا۔ باہر سے ایک فوجی افسر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"افسر! مادام بے ہوش ہو گئی ہیں۔ فوراً ڈاکٹر کو بلوائیے۔"

آفیسر نے ایک سپاہی کو دوڑایا کہ ڈاکٹر کو اپنے ساتھ لے آئے۔ پھر اس نے کہا۔

"مسٹر خورشید آپ لوگوں پر سے پہرہ اٹھا دیا گیا ہے۔ اب یہاں صرف آپ ہی جیسے اہم لوگ ہیں لہٰذا اب آپ کی زبان سے قیامت کی باتیں عام لوگوں تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ ایک بات یاد رکھیں کہ آپ لوگ اس جزیرے میں آزاد ہیں۔ لیکن یہاں سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

خورشید بلگرامی نے سر ہلا کر کہا۔

"ہمیں اتنی تو سمجھ ہے کہ ہم جزیرے سے نکل کر سمندر میں تیر نہیں سکیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ مادام کے پاس چلا گیا۔ شام کو پہلی بار ماہرین فلکیات نے گلوب آرک میں قدم رکھا۔ کیونکہ وہاں نصب کی ہوئی دوربین کے ذریعہ دُمدار ستارے کا حال چال معلوم کرنا تھا۔ وہاں ابھی عورتوں کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے ہمت راؤ اپنی روپ وتی کو کاٹیج میں چھوڑ کر آیا تھا۔ گلوب آرک فن تعمیر کا ایک ایسا نمونہ تھا جو دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ زمین سے گلوب آرک کی بیرونی دہلیز تک ایک زینہ تھا جو بھاری زنجیروں سے اٹھائے ہونے کے بعد دروازے کی طرح بند ہو جاتا تھا۔ بیرونی دروازے سے رہائشی حصہ تک جانے کے لیے ایک پل تھا۔ پل کے نیچے ایک بہت بڑا جنریٹر بجلی پیدا کرنے کے لیے رکھا گیا تھا۔ اس وقت اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ جزیرے کے پاور ہاؤس سے بجلی سپلائی کی جا رہی تھی۔

ماہرین فلکیات ایک انجینئر کی رہنمائی میں پل سے گزرنے کے بعد ایک لفٹ کے پاس آئے۔ پھر لفٹ کے ذریعہ ساتویں منزل پر پہنچ گئے۔ ایک کمرے کے وسط میں ایک توپ نما بڑی سی دوربین نصب تھی۔ ہمت راؤ تمام ماہرین فلکیات میں سینئر تھا اس لیے وہ دوربین کے پیچھے ایک اونچی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دوسرے لوگ آس پاس کی کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ان کے سامنے چھوٹی چھوٹی میزوں پر کاغذ اور قلم رکھے ہوتے تھے۔ ہمت راؤ نے کہا۔

"دمدار ستارہ سورج سے تین ڈگری پر ہے۔ پچھلی شام ہم نے گرین د[illegible] آبزرویٹری سے دیکھا تھا۔ یہاں سے وہ ستارہ چھ بجکر پینتیس منٹ پر دیکھا جا سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے انجینئر کو اشارہ کیا۔ انجینئر کمرے سے باہر چلا گیا۔ دو منٹ کے بعد ہی کمرے میں گڑگڑاہٹ کی آواز گونجنے لگی۔ وہ کمرہ اوپر کی طرف اٹھ رہا تھا اور اس کی چھت دو حصوں میں تقسیم ہو کر کھل رہی تھی۔ سر پر کھلا آسمان نظر آنے لگا تھا۔ وہ کمرہ ایک مقررہ بلندی تک پہنچ کر ٹھہر گیا۔ ہمت راؤ نے اپنی کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے کمرے کی دوسری مشینوں کو آپریٹ کیا۔ ان مشینوں کے اسکرین روشن

کُتّے کا بچہ

بیگم نعمانی اپنے خاوند کے دیر سے گھر آنے پر بہت شاکی تھیں۔ نعمانی صاحب بھی اپنی یہ عادت ترک کرنے سے معذور تھے، گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوتے تھے اور ڈھیٹ پن سے زندگی گزار رہے تھے۔

بیگم صاحبہ نے کسی سے حال ہی میں کُتّے کا ایک پلا خریدا تھا اور اسے جی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ ان کے پڑوسی ظفر صاحب جب ایک صبح اپنے دفتر کو روانہ ہوئے تو بیگم نعمانی بنگلے کے پھاٹک پر کھڑی تھیں۔ ظفر صاحب نے مروت کے طور پر کار روک کر پوچھا: "بیگم صاحبہ! کُتّے کے بچے کا کیا حال ہے؟"

بیگم نعمانی نے تیوری چڑھا کر جواب دیا۔ "کل رات سے گھر نہیں آیا۔"

مرسلہ: رفیق طاہر، شیخوپورہ

ہو گئے۔ دوسرے ماہرین فلکیات کاغذ قلم سنبھال کر تیار ہو گئے۔

گھڑی میں چھ بجکر تیس منٹ ہو چکے تھے۔ ہمت راؤ دوربین سے آنکھ لگا کر فوکس درست کرنے لگا۔ اس کے حساب سے تین منٹ پہلے ہی خلا میں وہ سرخ دھبہ نظر آنے لگا۔ وہی دھبہ مشینوں کی اسکرین پر سیاہ نقطہ کی طرح زمین کی گراف لائن پر متحرک رہا تھا۔ ہمت راؤ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ دوربین کی آنکھ ایک سرخ ٹمٹماتے ہوتے دھبے کو پیش کر رہی تھی مگر وہ دھبہ اپنی جسامت میں کتنا وسیع و عریض تھا۔ یہ تمام ماہرین جانتے تھے۔ دمدار ستارے کی اطراف بھڑکنے والے شعلے ہی سینکڑوں میل کی دوری تک لپکتے تھے۔ ہمت راؤ نے دوربین سے دیکھنے کے دوران اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"ایک پوائنٹ نوٹ کرو کہ ستارے کی دُم ہمیں نظر نہیں آئے گی۔ کیونکہ اس کی دُم زمین کی طرف ہے۔ ہمیں صرف اس کے جسم کا پھیلاؤ نظر آتا ہے۔ اس پھیلاؤ کی کوئی مخصوص شکل نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کے اطراف شعلے بھڑک رہے ہیں۔"

ایک منٹ کے بعد دوربین اندھی ہو گئی۔ دمدار ستارہ خلائی ڈایاگرام سے غائب ہو گیا تھا۔ ہمت راؤ نے دوربین کے پاس سے گھوم کر کہا۔

" یہ بہت قریب آچکا ہے۔ آج سے چار دنوں کے بعد ۱۲ر دسمبر سے یہ عام لوگوں کو بھی دکھائی دے گا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ دمدار ستارہ سورج سے تین ڈگری پر ہے۔ آفتاب کی چمک دمک میں یہ دن کے وقت نظر نہیں آئے گا۔ اگر موسم ٹھیک ہو تو ہر شام آفتاب غروب ہونے کے آٹھ منٹ بعد ایک نقطے کے برابر دکھائی دے سکتا۔ پھر ہر شام اس کی جسامت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ زمین کے قریب آتا جارہا ہے۔ یہ صرف چند سیکنڈ کے لیے نظر آیا کرے گا۔ کیونکہ زمین سورج کو غروب کرنے کے بعد تین ڈگری اور گھومے گی۔ تو وہ ستارہ افق میں گم ہو جائے گا۔"

ان کے درمیان دمدار ستارے پر بحث شروع ہو گئی۔ وہ ایک دوسرے کی تائید اور تردید کرنے لگے۔ گلوب آرک کے باہر جزیرے میں رات ہو چکی تھی مگر اندھیرا نہیں تھا۔ دور دور تک ہیڈ لائٹس کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ روپ وتی تنہا کاٹیج میں نہیں رہ سکتی تھی۔ پہلے وہ ریکریشن ہال میں گئی۔ وہاں دھیمے سروں میں آرکسٹرا کی آواز ابھر رہی تھی۔ حسین عورتیں اپنے محافظ مردوں کے ساتھ ڈانس کر رہی تھیں۔ ان کے حسین تراشیدہ جسموں سے اٹھنے والی خوشبو، شراب کے بھبکوں میں گڈمڈ ہو رہی تھی۔ وہاں عجیب گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ روپ وتی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ مرد اس کے حسن سے متاثر ہو کر اسے دیکھ رہے ہیں یا اس کے پہناوے سے دلچسپی لے رہے ہیں کیونکہ وہاں کے لوگوں نے شاید ہی کسی عورت کو ساڑھی اور بلاؤز میں دیکھا ہو گا۔ مگر اپنا غرور قائم رکھنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ حسین عورتیں اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھ رہی تھیں۔

وہاں اس کا دل نہیں لگا۔ وہ ایک پیگ حلق سے اتارنے کے بعد ریکریشن ہال سے باہر آ گئی۔ باہر آ کر پتہ چلا کہ دل تو خورشید بلگرامی کی طرف لگا ہوا ہے۔ اسے یہ تجسس تھا کہ وہ قیامت کے بعد بھی زندہ رہے گی یا نہیں؟ اور یہ بات وہی نجومی بتا سکتا تھا۔ وہ مستی میں جھومتی ہوئی ایک نمبر کاٹیج کی طرف جانے لگی۔ سمندر سے آنے والی سرد ہوائیں اس کے حسین مکھڑے کو چومتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ اور اس کی ساڑھی کے آنچل کو اس کے خیالوں کی طرح اونچا اڑاتی جا رہی تھیں۔

کاٹیج کے اطراف اب پہرہ نہیں تھا کسی نے اسے روکا نہیں۔ وہ کاٹیج کے اندر آ گئی۔ اس نے ایک کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں بستر پر ایک بوڑھی عورت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی ظاہری حالت سے پتہ چلتا تھا کہ اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ وہ چھت کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے پاس ایک جوان آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ مگر وہ نہیں تھا جس کی تلاش میں وہ آئی تھی۔

وہ دوسرے کمرے کے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ کمرے میں وہ سنہری داڑھی والا جائے نماز پر سجدے کر رہا تھا۔ ایک بھینی بھینی سی خوشبو اس کے کمرے میں آئی۔ ہاں آئی ہو گی۔ وہ تو اس دنیا کے رنگ و بو سے دور عبادت کی گہرائی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس وقت وہ نہیں جانتا تھا کہ کون سی قیامت آنے والی ہے اور کون سی آ چکی ہے۔ وہ تو ہوش سنبھالنے کے بعد سے یہی دیکھتا آرہا تھا کہ اخلاق اور تہذیب پر قیامت برپا ہوتی رہتی ہے اور وہ نماز کے گلوب آرک میں پناہ لیتا رہتا ہے۔

التحیات اور درود شریف پڑھنے کے بعد وہ سلام پھیرنے لگا۔ پہلے دائیں طرف، پھر بائیں طرف السلام علیکم ورحمتہ اللہ کہتے ہی وہ ٹھٹھک گیا۔ وہ بائیں طرف دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ خورشید بلگرامی کی گردن جیسے گھوم کر رہ گئی تھی۔ وہ روپ وتی کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے برسوں سے اسے خیالوں میں خوابوں میں اور جاگتی آنکھوں کے نظاروں میں دیکھتا آیا ہو۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ نماز ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ ابھی دعا باقی تھی اور وہ دعا سے پہلے ہی آ گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی قبلہ رُو ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ پھر دل ہی دل میں گڑگڑانے لگا۔

" میرے معبود! یہ کیا بھید ہے؟ کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ نہیں نہیں خواب میں نماز ہو سکتی ہے مگر نماز میں خواب اور غفلت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ میں باوضو ہوں اور جاگتے ہوتے ذہن سے نماز ادا کر رہا ہوں۔ اے مالکِ کون و مکاں! اے عالم الغیب تو ہی بتا کہ یہ کیا ہے۔ اتنی دور اس جزیرے میں مے۔ مے۔ میری بچی!۔۔۔ میری۔۔۔ ماجدہ کہاں سے آ گئی۔۔۔۔"

یکایک اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا۔ اس میں اتنی سکت نہ رہی کہ وہ دعا کے لیے بیٹھ سکتا۔ وہ روتا سسکتا ہوا سجدے میں گر پڑا۔ " میری بچی، میری بیٹی، نہیں میں شرم سے مر جاؤں گا۔ خدایا تو اسے واپس بھیج دے۔ میری ساری عمر کی عبادتوں کی لاج رکھ لے۔ نہیں تو میں سجدے سے سر نہیں اٹھاؤں گا۔ بیٹی کو اپنا منہ نہیں دکھاؤں گا۔"

وہ پھر بلک بلک کر رونے لگا۔ روپ وتی نے مسکراتے ہوئے اپنے پرس سے بکھری کیپسلس کا ایک پیکٹ نکالا۔ اس پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا۔ پھر لائٹر سے اسے سلگاتی ہوئی بولی۔

" مسٹر نمازی! تم کتنی ہی لمبی نماز پڑھو۔ میں یہاں سے ٹلنے والی نہیں ہوں۔ میں تم سے اپنی زندگی کا حساب پوچھ کر ہی جاؤں گی۔"

اس کی باتیں خورشید بلگرامی کے دل میں نشتر کی طرح چبھ رہی تھیں۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے معبود سے کہا۔

" خدایا! میں اس کی زندگی کا حساب کیسے دوں؟ میرا کیا قصور ہے؟ میں نے جب سنا کہ میری ہونے والی بیوی کا نام عابدہ ہے تو نام سے دھوکہ کھا گیا۔ میری سوتیلی ماں نے بھی مجھ سے جھوٹ کہا کہ عابدہ نمازی اور نیک چلن عورت ہے۔ شادی کے بعد پتہ چلا کہ وہ بہت ہی اونچے خواب دیکھنے والی فیشن ایبل عورت ہے۔ میری زندگی تلخ ہو گئی۔ میں اسے پردے میں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ پردے سے نکل بھاگنا چاہتی تھی۔

ایک برس تک میری لگام مضبوط رہی۔ وہ میرے گھر سے نکل کر کہیں جا نہ سکی۔ اس دوران ماجدہ پیدا ہوئی۔ میرا حساب درست ہے کہ ماجدہ میری ہی بیٹی تھی۔ مگر یہ بیٹی میری کمزوری بن گئی۔ عابدہ بہت چالاک تھی۔ چالاک کیا تھی، میری سوتیلی ماں کی شاگرد تھی۔ اس کے بہکانے پر وہ ماجدہ کو لے کر میکے بیٹھ گئی۔ میں نے اسے واپس آنے کے لیے کہا تو اس نے جواب دیا۔

" تمہارا جیسا نجومی میرے میک اپ کا خرچ پورا نہیں کر سکتا۔ میں بھی تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

میں نے دھمکی دی۔ " تم میرے ساتھ نہیں رہو گی تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔"

" اگر تم طلاق دو گے تو میں ماجدہ کو لے کر کہیں بھاگ جاؤں گی۔ تم مجھے بازاری عورت کہتے ہو۔ میں تمہاری بیٹی کو بازار میں بٹھا دوں گی۔"

یہ بات سن کر میں سکتے میں آ گیا۔ میں دوسروں کا مستقبل پڑھتا ہوں، میرے سامنے وہ میری بیٹی کے مستقبل کا حال سنا رہی تھی۔ میں نے مصلحت سے کام لے کر صلح کرنی چاہی۔ اس نے کہا۔

" صلح اسی صورت میں ہو گی کہ تم مجھے طلاق نہ دو۔ میں اپنے ابا کے پاس رہوں گی۔ تم سے اپنا خرچ نہیں لوں گی۔ صرف ماجدہ کے لیے پانچ سو روپے ماہوار دے دیا کرو۔"

اس کے باپ نے بھی اس کی حمایت کی۔ مجھے یہ منظور نہ تھا، مگر میں اسے دشمن بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ رفتہ رفتہ عابدہ کو منا کر گھر لے آؤں گا۔ یہ سوچ کر میں واپس آ گیا۔ پھر ہمیشہ ہی اس کے میکے سے تنہا واپس آتا رہا۔ کیونکہ عابدہ کے باپ اور میری سوتیلی ماں کا گٹھ جوڑ تھا۔ اس کے سائے میں عابدہ پتھر بن گئی تھی لیکن میری ماجدہ کا بہت خیال رکھتی تھی آخر اس کی اپنی ماں تھی۔ رفتہ رفتہ مجھے صبر آ گیا۔ میں نے سوچا۔ چلو اچھا ہے۔ اب عابدہ سے روز جھگڑا نہیں ہوتا ہے۔ میں شام کو وہاں جا کر اپنی بیٹی کو گود میں کھلا لیا کرتا ہوں۔ میری پدرانہ محبت کی تسکین ہو جاتی ہے۔

لیکن وہاں جو کھیل کھیلا جا رہا تھا، وہ بہت عرصہ بعد سمجھ میں آیا۔ عابدہ کا باپ رئیسانہ ٹھاٹ باٹ سے زندگی گزارنے لگا تھا۔ ان کے گھر کی دوسری منزل تعمیر ہو رہی تھی۔ نئے فرنیچر اور ٹی وی وغیرہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ عابدہ روز نیا لباس پہن کر کہیں جاتی تھی۔ اور ماجدہ کو اپنے باپ کے پاس چھوڑ دیتی تھی۔ ایک بار میں نے اسے

دادی اماں نے شوق میں آ کر بال کٹوا دیئے اور کنگھی سے انہیں سنوار دیا پھر اپنی پوتی کو بلا کر پوچھا۔

" کیا اب بھی تمہاری دادی بوڑھی لگتی ہے۔؟"

" نہیں" پوتی نے جواب دیا " بوڑھا مرد"

مرسلہ، محمد منعم ظفر۔ لاہور

کسی کی کار میں دیکھا تو مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ اس روز عابدہ سے خوب جھگڑا ہوا۔ نوبت طلاق تک پہنچی مگر میں طلاق نہ دے سکا۔ کیونکہ اب میری بیٹی چودہ برس کی ہو گئی تھی۔

ماجدہ نے مجھے اشارے سے سمجھایا کہ وہ ماں کے پاس نہیں رہنا چاہتی ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ " بیٹی! تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔"

" خبردار!" عابدہ کا باپ ہمارا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کھلا ہوا چاقو تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ " اگر خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ اکیلے چلے جاؤ۔"

وہ بھی ایک باپ تھا مگر بے غیرت تھا۔ بیٹی کو کمائی کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ میں بھی ایک باپ ہوں۔ اپنی بیٹی پر بے غیرتوں کا سایہ دیکھ کر کانپ جاتا تھا۔ میں کمزور اور بزدل نہیں تھا کہ ایک کھلے ہوئے چاقو سے ڈر جاتا۔ لیکن مجھے بیٹی کی عزت کا خیال تھا۔ اگر میں جھگڑا بڑھاتا تو یہ بات سب کو معلوم ہو جاتی کہ اس کی ماں بدکار ہے۔ بیٹی کے دامن پر ماں کی بدنامی کا داغ لگا کر میں اسے کسی شریف گھرانے کی بہو نہیں بنا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے ماجدہ سے کہا۔

" بیٹی! تم فکر نہ کرو۔ میں ابھی جا کر قانونی کارروائی کرتا ہوں۔ انشاءاللہ میں بہت جلد تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔"

میں ماجدہ کو روتا ہوا چھوڑ کر گھر سے نکلا تاکہ فوراً ہی کسی وکیل کی خدمات حاصل کروں۔ اس گھر سے ذرا دور عابدہ ایک کار کے پاس کھڑی کسی ادھیڑ عمر کے آدمی سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی منہ پھیر کر چلی گئی۔ اس کار والے نے مجھے مخاطب کیا۔

" کیا آپ ہی مسٹر خورشید ہیں؟ میں آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ " میں اس عورت کے کسی شناسا سے بات کرنا پسند نہیں کرتا۔"

" آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں دراصل آپ کو اس عورت

کی مکاریوں سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں"۔

" پھر تو میں آپ کی بات ضرور سنوں گا۔ فرمایئے"۔

اس نے مجھے کار میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ پھر وہ کار اسٹارٹ کرتے ہوتے کہنے لگا۔

" یہ عابدہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ آپ اس کی بیٹی کو زبردستی لے جانا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں آپ کے پیچھے غنڈے لگا دوں۔ مگر آپ تو نہایت ہی شریف آدمی نظر آتے ہیں۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔ آپ کو مشورہ دوں گا کہ ایسی عورت سے لڑنے جھگڑنے کے بجائے قانونی کارروائی کریں"۔

اس نے میرے دل کی بات کہی تھی۔ میں نے کہا" میں یہی کرنے جا رہا ہوں"۔

" اگر آپ کی جان پہچان کا کوئی وکیل نہ ہو تو میں ابھی جا کر اپنے وکیل سے کہوں گا۔ فوراً ہی آپ کا حکم ہو جائے گا"۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی تعریفیں کیں۔ اس نے مجھے گھر تک پہنچا کر کہا۔

" آپ یہاں میرا انتظار کریں۔ وکیل صاحب سے چھ بجے کے بعد ملاقات ہوگی۔ میں یہاں آکر آپ کو لے جاؤں گا"۔

میں اس کا انتظار کرنے کے لیے گھر میں بیٹھ گیا۔ میں نے کبھی تھانے کچہری کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ مجھے ایک راہنما ملا تو میں نے اس پر بھروسہ کر لیا۔ ٹھیک چھ بجے ایک ٹیکسی میرے دروازے پر آئی۔ ڈرائیور نے کہا کہ وہ ملک صاحب کی ٹیکسی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ میں فوراً ٹیکسی میں بیٹھ کر وکیل صاحب کے پاس پہنچ جاؤں جہاں ملک صاحب میرا انتظار کر رہے ہیں۔

میں ٹیکسی میں آکر بیٹھا۔ ڈرائیور مجھے لے کر سیدھا تھانے پہنچ گیا۔ وہاں پولیس والے ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے مجھے اور ڈرائیور کو پکڑ کر حوالات میں ڈال دیا کیونکہ کار کی ڈگی میں چرس کا ایک تھیلا رکھا ہوا تھا۔ میں چیخنے چلانے لگا کہ میں مجرم نہیں ہوں۔ مجھے جھوٹے الزام میں پھانسا جا رہا ہے مگر وہاں کسی نے میری نہیں سنی۔ یہ اب سے چھ برس پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں میں آج کی طرح عالمی شہرت یافتہ نجومی نہیں تھا کہ میری آواز اعلیٰ حکام تک پہنچ جاتی۔ میں نے حوالات میں ڈرائیور کا گریبان پکڑ کر کہا۔

" بدمعاش! میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ تو نے یہ کب کی دشمنی نکالی ہے"۔

اس نے کہا" مولوی صاحب! میں تو آپ کو جانتا بھی نہیں، آپ سے دشمنی کیا کروں گا۔ میں تو خود جیل کے اندر جانا چاہتا تھا۔ اللہ نے چاہا تو کل حوالات سے نکل کر جیل پہنچ جاؤں گا"۔

" کیا تم پاگل ہو کہ اپنی مرضی سے جیل میں جانا چاہتے ہو؟"

" پاگل نہیں جی! یہ اپنا دھندا ہے۔ اندر باہر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اب تین دن سے تھانیدار صاحب کو بول رہا تھا کہ میرے کو اندر کرو۔ مگر تھانیدار صاحب بولتا تھا۔ پہلے کوئی جرم کرو۔ پھر یہ ملک صاحب سے بولا کہ جمن دادا جیل میں ہے۔ اس کو ایک پرائیویٹ بات بولنا ہے۔ نہیں بولوں گا تو یار کا دھندا خراب ہو جائے گا۔ ملک صاحب نے کہا۔ تھوڑا صبر کرو۔ وہ میرے سے کوئی کھیلا کرائے گا۔ ابھی آکے بولا کہ میرے کو کیا کرنا ہے۔ بس میں نے کر دیا۔ آپ کو یہاں لیکر آگیا۔ مولوی صاحب! آپ ہم لوگوں کو مسجد میں بلاتے ہیں۔ کیا ہم کبھی آپ کو جیل میں نہیں بلا سکتے۔ ایک دوسرے کے گھر آنے جانے سے محبت بڑھتی ہے۔ ہی ہی ہی ہی ....."

میں نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ میرا دل اندر ہی اندر ڈوب رہا تھا۔ یہ خیال بار بار پریشان کر رہا تھا کہ میں اپنی معصوم بیٹی کو ایک گندے ماحول میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ اس وقت مجھے یہ نہیں سوچنا چاہیے تھا کہ لڑائی جھگڑے بڑھیں گے تو میری بیٹی بدنام ہو جائے گی۔ لیکن اس وقت میں نے شرافت اور دانشمندی سے کام لیا تھا۔ ایک صحیح طریقہ سے بیٹی کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ قانون کے دروازے پر دستک دینے جاؤں گا تو خود دروازے کے اندر ہو جاؤں گا۔

آدھی رات کے بعد دو سپاہی اس ڈرائیور کو باہر لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس کے چیخنے چلانے کی آواز سنی۔ میں جلدی سے اٹھ کر آہنی دروازے کے پاس آکر دیکھنے لگا۔ ایک مٹا کانسٹیبل ڈرائیور پر ڈنڈے برسا رہا تھا اور وہ مار کھانے والا فرش پر گر کر تڑپ رہا تھا۔ ایک پولیس انسپکٹر کہہ رہا تھا۔

" تم اسی طرح مار کھاتے کھاتے مر جاؤ گے۔ ہم تمہاری لاش کہیں پھنکوا دیں گے۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ تم یہاں گرفتار ہونے آتے تھے اور یہاں سے مردہ واپس گئے ہو"۔

تھوڑی دیر تک مار کھانے کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی۔ تھانیدار نے کہا۔

" گدھے کے بچے! تمہارا وہ ملک مختار میرے پاس کل آیا تھا۔ مجھ سے پہلے جو تھانیدار تھا۔ ملک مختار اسے ماہانہ ایک ہزار روپے دیتا تھا اور اطمینان سے چرس اور شراب کی خفیہ سپلائی کا دھندا کرتا تھا۔ اس نے مجھے بھی ہزار روپے ماہوار کی پیشکش کی۔ میں نے قبول کر لیا۔ آج شام کو ساڑھے پانچ بجے وہ میرے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ چھ بجے کے بعد اس کا ٹیکسی ڈرائیور ایک مولوی ٹائپ کے آدمی کو لائے گا۔ ڈگی میں چرس ہوگی۔ لہٰذا میں اس خورشید نامی آدمی کے خلاف رپورٹ درج کر کے اس کو کچہری اور جیل تک پہنچا دوں"۔

تھانیدار نے ڈرائیور کے منہ پر ایک ٹھوکر مار کر کہا۔

" اب میرے دو سوالوں کا جواب دو۔ ملک مختار کے چرس اور شراب کا گودام کہاں ہے؟ اور اس شریف آدمی کو کیوں پھانسا جا رہا تھا؟"

ڈرائیور کی قوت برداشت ختم ہو چکی تھی۔ اس نے مار سے بچنے کے لیے بتا دیا کہ ملک صاحب کی ایک کوٹھی سوسائٹی میں ہے۔ وہاں چرس اور شراب چھپا کر رکھی جاتی ہے۔ پھر اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

" ملک صاحب اسی مولوی کو سال دو سال کے لیے اندر کرانا چاہتے تھے کیونکہ یہ اپنی بیوی کے راستے کی دیوار بنا ہوا تھا۔ اس کی بیوی اپنی جوان بیٹی سے دھندا کرانا چاہتی تھی اس لیے....."

میں نے چیخ کر کہا" بس کرو۔ آگے نہ کہنا ورنہ میں اپنی جان دے دوں گا"۔

اس وقت شرم کے مارے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ اس لیے اپنا سر آہنی دروازے کی سلاخوں سے ٹکرانے لگا۔ ہر ٹکر کے ساتھ میری معصوم بچی کا چہرہ سامنے آجاتا تھا۔ ظالموں نے ایک بچی کی زندگی تباہ کرنے کے کیسے کیسے منصوبے بنائے تھے۔ انہیں شرم نہیں آئی۔ مگر میں شرم سے مر جانا چاہتا تھا لیکن دو سپاہیوں نے آکر مجھے پکڑ لیا۔ انسپکٹر نے کہا۔

" خورشید صاحب! حوصلہ سے کام لیجیے۔ میرے ساتھ چلیے۔ میں آپ کی بیٹی آپ کو واپس دلاؤں گا"۔

میں انسپکٹر اور چھ سپاہیوں کے ساتھ ایک جیپ کار میں بیٹھ کر گیا۔ سوسائٹی کی ایک خاموش گلی میں ملک مختار کی پرائیویٹ کوٹھی تھی۔ انسپکٹر نے مجھ سے کہا۔

" پہلے ہم یہاں چھاپہ ماریں گے۔ ایسا نہ ہو کہ ملک مختار اپنا اسٹاک یہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دے۔ اسے موقع نہیں دینا چاہیے۔ اس کے بعد آپ کی سسرال جا کر آپ کی بیٹی کو آپ کی حفاظت میں دوں گا"۔

سپاہیوں نے کوٹھی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ انسپکٹر نے دروازے پر پہنچ کر کال بیل کا بٹن دبایا۔ میں اس کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اور دروازہ کھلنے کے بعد ملک مختار کو ایک مجرم کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا مگر انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ دروازہ کھلتے ہی مجھے عابدہ کی صورت نظر آئی۔ وہ مجھے اور انسپکٹر کو دیکھ کر بوکھلا گئی۔ فوراً ہی پلٹ کر بھاگنے لگی۔ میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

" بھاگتی کہاں ہو۔ جواب دو کہ ایک بدمعاش کی کوٹھی میں کیا کر رہی ہو؟"

وہ چیخنے لگی" مجھے چھوڑ دو۔ میں یہاں کسی بری نیت سے نہیں آئی ہوں۔ ملک صاحب سے قرض مانگنے آئی ہوں"۔

اس کی آواز سن کر ملک مختار وہاں آگیا۔ پہلے تو وہ بھی گھبرایا۔ پھر مسکرا کر بولا۔

" ہیلو انسپکٹر! یہ تو ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ آپ اس آدمی کو یہاں کیوں لاتے ہیں؟"

انسپکٹر نے کہا" ابھی معلوم ہو جائے گا۔ میں یہاں سے چرس اور شراب کا اسٹاک برآمد کرنے آیا ہوں۔ یہ کوٹھی چاروں طرف سے گھیر لی گئی ہے۔ لہٰذا فرار ہونے یا میرا وقت ضائع کرنے کی کوشش نہ کرو"۔

ایک سپاہی نے ملک مختار کی پشت سے رائفل کی نال لگا دی۔ اس نے بے بسی سے کہا۔

" انسپکٹر! آپ کوٹھی کے اندر پہنچ گئے تو خفیہ اسٹاک تک بھی پہنچ جائیں گے لیکن آپ کی دوستی سمجھ میں نہیں آئی۔ کل تو آپ نے دوست بن کر مجھ سے رقم لی تھی۔ اگر وہ کم ہے تو میں اور دو ہزار دے سکتا ہوں"۔

انسپکٹر ایک کمرے کی طرف بڑھا تو اس نے کہا" آپ وہاں نہ جائیں۔ مال دوسرے کمرے میں ہے۔ میں آپ کو پانچ ہزار دوں گا"۔

انسپکٹر اس کی بات ان سنی کرتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ اسے کھولنے کی کوشش کی۔ پھر اس پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

" اندر کون ہے۔ دروازہ کھولو اور چپ چاپ ہاتھ اٹھا کر باہر آجاؤ"۔

" میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔ تم دروازہ توڑ ڈالو۔ اب تمہیں میری لاش ہی ملے گی"۔

وہ آواز سنتے ہی میں چونک گیا۔ کمرے کے اندر ماجدہ تھی۔ میں اپنی بیٹی کی آواز لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ ایک دم سے میرے تمام جسم میں تھرتھری پیدا ہو گئی۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے دروازے کے پاس آیا پھر اسے آواز دی۔

" میری بچی۔ میری ماجدہ! بیٹی میں ہوں۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ گھبراؤ نہیں، دروازہ کھول دو"۔

" نہیں ....." اس کی چیخ سنائی دی۔ پھر ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے وہ اپنی آواز کو دبانے کی کوشش کر رہی ہو اور ہزار ضبط کے باوجود آواز جبراً حلق سے نکل رہی ہو۔ وہ بہت ہی اذیتناک کرب میں مبتلا تھی۔

میں نے دروازے کو پیٹنا شروع کیا" ماجدہ! اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم دروازہ کھولو بیٹی!"

" نہیں میں دروازہ نہیں کھول سکتی۔ میں آپ کو منہ نہیں دکھا سکتی۔ نہیں، نہیں، نہیں نہیں ....."

میرا خون غصہ کی آگ میں کھولنے لگا۔ میں نے مٹھیاں بھینچ کر عابدہ اور ملک مختار کو دیکھا۔ میں ان کا گلا گھونٹ کر مار ڈالنا چاہتا تھا۔

لیکن ماجدہ کی آواز نے مجھے روک لیا۔

"اباجان! آپ نے آنے میں دیر کردی۔ بس اب واپس چلے جائیں۔ خدا کی قسم میں جیتے جی آپ کو اپنا منہ نہیں دکھاؤں گی۔ آپ سے بھی التجا کرتی ہوں کہ میرے مرنے کے بعد آپ میرا منہ نہ دیکھیں۔ میری اتنی سی شرم رکھ لیں اباجان......"

اس کی بات ختم ہوتے ہی اندر کوئی چیز دروازے سے آکر ٹکرائی۔ انسپکٹر نے کہا۔ "یہ کرسی گرنے کی آواز ہے......"

میں پھر زور زور سے دروازہ پیٹ کر آواز دینے لگا مگر جواباً اس کی آواز نہیں مل رہی تھی۔ میں انسپکٹر کے ساتھ دروازے پر ٹکریں مارنے لگا۔

پہلی ٹکر — "بول میری بے شرم تقدیر! میری معصوم بیٹی کمرے میں شرم سے منہ کیوں چھپا رہی ہے؟"

دوسری ٹکر — "بول میرے باحیا ضمیر! تو ہمیں اس لیے شرافت پر اکساتا ہے کہ دنیا والے ہمیں بزدل اور بیوقوف سمجھ کر ہماری عزت سے کھیلتے رہیں؟"

تیسری ٹکر — "ہم وہ لوگ ہیں کہ سر سے پانی گزر جانے کے بعد اپنا سر پتھروں سے ٹکراتے ہیں۔ کچھ نہیں پاتے، اپنا ہی سر پھوڑ لیتے ہیں۔"

ٹکر پہ ٹکر۔ کوئی چارہ نہیں۔ دوا گردے سے نہیں ٹکراتی۔ دعا آسمان سے نہیں ٹکراتی۔ حیا، بے حیا سے نہیں ٹکراتی۔ ارے او قیامت! تو ہی زمین سے ٹکرا جا — ٹکرا جا...... دھڑام کی آواز کے ساتھ دروازہ ٹوٹ کر فرش پر آگیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے حلق سے چیخ نکلی میں بھی ٹوٹ کر فرش پر پہنچ گیا۔ پھر وحشت و جنون سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔

اوپر چھت سے پنکھا لٹک رہا تھا۔ پنکھے سے رسی لٹک رہی تھی اور رسی کے پھندے میں ماجدہ جھول رہی تھی۔ ماں نے بے حیائی کا جھولا جھلایا۔ بیٹی موت کے جھولے میں جھول گئی۔ اس نے پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالنے سے پہلے اپنے چہرے کے چاروں طرف دوپٹے کو اچھی طرح لپیٹ کر باندھ لیا تھا۔ اپنا منہ اچھی طرح چھپا لیا تھا۔ اس کی باتیں میری سماعت میں گونج رہی تھیں۔

"خدا کی قسم میں جیتے جی اپنا منہ نہیں دکھاؤں گی۔ آپ سے بھی التجا کرتی ہوں کہ میرے مرنے کے بعد آپ میرا منہ نہ دیکھیں میری اتنی سی شرم رکھ لیں اباجان......"

ہائے میری لاڈلی۔ ایسی شرم والی بیٹی کہیں نہیں دیکھی جو مرنے کے بعد بھی منہ چھپا رہی تھی۔

خدایا! وہ ایسی پارسا اور پاکیزہ تھی کہ فرشتے اس کے آنچل پر نماز پڑھتے۔ پھر اس آنچل تک شیطان کیسے پہنچ گیا؟ خدایا! تیری خدائی سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟

مگر ایک بات سمجھ میں آگئی کہ قیامت اس دنیا میں جب بھی آئے، وہ ایسی دہشت ناک اور اذیت ناک نہیں ہوگی، جیسی کہ یہ دلوں پر ٹوٹنے والی قیامت ہوتی ہے۔

اس قیامت سے بیٹی کی باحیا زندگی اور باپ کا دل ہمیشہ کے لیے ٹوٹ چکا ہے۔ میرے مالک!"

خورشید بلگرامی سجدے میں ساکت و جامد تھا مگر اندر سے تڑپ رہا تھا۔ وہ خداوند کریم کو اپنی داستان نہیں سنا رہا تھا جو سب کچھ جانتا ہو اسے کوئی کیا بتا سکتا ہے؟ وہ تو روپ وتی کو دیکھ کر خود بخود اپنی ماجدہ کی طرف بہہ گیا تھا۔

جب اتنی زیادہ مشابہت ہو کہ روپ وتی، ماجدہ نظر آئے تو خورشید بلگرامی کا دھوکا کھا جانا یقینی تھا۔ بہت دیر تک وہ اسی تذبذب میں رہا کہ ماجدہ کو اپنا منہ کیسے دکھائے؟ کیونکہ بیٹی نے شرم سے منہ چھپایا تھا تو وہی بات باپ میں بھی تھی۔ اگر وہ سجدے سے سر اٹھاتا تو دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھ لیتے۔

سجدہ ایک ایسا عمل ہے کہ پیشانی زمین سے لگتے ہی دوران خون بڑھ جاتا ہے۔ خون تیزی سے دماغ کی طرف گردش کرنے لگتا ہے دماغ سے بوکھلاہٹ اور بدحواسی کا غبار چھٹ جاتا ہے۔ ذہن تیزی سے صحیح اور مثبت انداز میں سوچنے لگتا ہے۔ خورشید بلگرامی جلدی ہوش و حواس میں رہ کر سوچنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ جو دروازے پر کھڑی ہے۔ میری ماجدہ ہی لگتی ہے مگر میری ماجدہ نہیں ہے۔ خدا کی قدرت ہے۔ ایک بیٹی چھین کر اس کی صورت اور مورت کی دوسری بیٹی دے رہا ہے۔ اس میں بھی اس معبود کی کوئی مصلحت ہوگی۔ وہ اپنی خدائی کو خود ہی سمجھتا ہے......"

یہ سوچتے ہی اس نے سجدے سے سر اٹھایا۔ پھر گردن گھما کر اسے دیکھا۔ روپ وتی نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر دھواں اس کی طرف چھوڑ دیا۔ خورشید بلگرامی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر پوچھا۔

"تم کون ہو؟ تمہاری صورت اور لباس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان سے آئی ہو۔ یہاں جزیرے میں ہندوستان کا ایک ہی شخص ہے ہمت راؤ۔ کیا تم اس کے ساتھ آئی ہو؟"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "تم تو ہاتھ دیکھے بغیر ہی سب کچھ بتا رہے ہو؟"

"ہاں! انسان کی بولی، اس کا لباس اور چال چلن بتا دیتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ تمہاری جنم پتری دیکھنا ضروری نہیں ہے۔ تم نے جب جنم لیا تو تمہاری انگلیوں میں یہ سگریٹ نہیں تھا۔ اس وقت تمہاری نظروں میں جال نہیں پھینکتی تھیں۔ یہ سب کچھ تمہارے ماحول نے تمہیں دیا۔ اگر تمہارا ماحول ایسا نہیں تھا تو پھر کوئی تمہیں وہاں لے گیا، جہاں اپنے سگریٹ کا دھواں دوسرے کے منہ پر پھینکا جاتا ہے۔"

روپ وتی کی انگلیوں کے درمیان پھنسا ہوا سگریٹ گر پڑا۔ کیونکہ انگلیاں ڈھیلی پڑ گئی تھیں کیونکہ نمائشی انداز میں جو بدن تنا ہوا تھا وہ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ کیونکہ اسے وہ ماحول یاد آگیا تھا جہاں پہلی بار اس کا باپ اسے لے گیا تھا۔ وہ یادیں بڑی کربناک تھیں۔ اس نے گھور کر خورشید بلگرامی سے پوچھا۔

"میری تمہاری کون سی جان پہچان ہے کہ مجھ پر کیچڑ اچھال رہے ہو؟"

"لوگ ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے کے لیے آپس میں ہاتھ ملا کر متعارف ہوتے ہیں۔ میں ہاتھ دیکھ کر تعارف حاصل کرلیتا ہوں رہ گئی کیچڑ اچھالنے کی بات تو پہلے تم نے دھواں اچھالا ہے۔"

وہ جوانی کی دھوپ میں تپ کر کندن بنی تھی۔ اس لیے فوراً ہی سمجھ گئی کہ اس کے سامنے بولنے والا پہلے تولتا ہے پھر بولتا ہے اور خوب بولتا ہے۔ اس نے اپنے گورے گورے ہاتھ کو بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس ہاتھ کو تھامنے کے لیے لوگ سپنے دیکھتے ہیں۔ دعائیں مانگتے ہیں۔ بھگوان سے پرارتھنا کرتے ہیں مگر یہ تمہارے پاس بن مانگی مراد کی طرح پہنچ گیا ہے۔ کیا اسے تھام کر میری تقدیر کا حال بتاؤ گے؟"

"مجھے افسوس ہے۔ میں نہیں بتا سکوں گا۔"

"کیوں؟ کیا تمہاری فیس بہت زیادہ ہے؟ اوہ ہونہہ میرے ہاتھ کو تھامنے کی فیس سے زیادہ نہیں ہوگی۔"

"لڑکی! تم بہت زیادہ بولتی ہو۔ کیا تم نے بزرگوں کا احترام کرنا نہیں سیکھا ہے؟"

"بزرگوں کا احترام؟ ہا ہا ہا ہا......" وہ قہقہے لگانے لگی۔ پھر ٹھہر کر بولی۔ "یہ بزرگ کیا ہوتے ہیں؟"

"بزرگ اس درخت کی جڑیں کہلاتے ہیں، جس کی شاخوں میں تمہاری جیسی اولادیں پھلتی پھولتی ہیں۔"

یک بیک روپ وتی کا قہقہہ گھٹ گیا۔ وہ غصے سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔

"ہاں پھلتی پھولتی ہیں۔ اور جب پھل کی طرح پک جاتی ہیں تو انہیں بازار میں بیچ دیا جاتا ہے۔ مجھے اس دنیا کے تمام بزرگوں اور بوڑھوں سے نفرت ہے۔ جب میری زندگی میں پہلی بار میری عزت لٹ رہی تھی تو میرا باپ مجھے بچانے کے لیے نہیں آیا۔ میں۔ میں تم جیسے بوڑھوں کو معاف نہیں کروں گی۔ میں۔ میں......"

بات ادھوری رہ گئی۔ کیونکہ خورشید بلگرامی کا سر چکرا گیا تھا۔ وہ کھڑے ہی کھڑے آگے پیچھے ڈگمگایا۔ پھر روپ وتی سے ٹکرایا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ بے سہارا ہو کر فرش پر گر پڑا۔ اس کا جسم یوں کانپ رہا تھا جیسے اندر سے زلزلے کے جھٹکے آرہے ہوں۔ اس نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ کو روپ وتی کی طرف اٹھا کر کہا۔

"ما۔ ما۔ ماجدہ! خدا کی قسم میں تیری عز۔ عزت کی طرف اٹھنے والے۔ اٹھنے والے ہاتھ کاٹ کر پھینک دیتا۔ مگر میں حوالات۔ حوالات میں تھا۔ جب۔ جب باہر آیا تو۔ تو دیر ہو چکی تھی۔ مجھے معاف۔ معاف کردو بیٹی......"

روپ وتی اس کا آخری فقرہ نہ سن سکی۔ "بیٹی" کا لفظ اس کے کانوں تک نہ پہنچ سکا۔ کیونکہ اسی وقت کاٹیج کے باہر ہمت راؤ اسے پکار رہا تھا۔

"روپ وتی! کیا تم یہاں ہو؟"

وہ تیزی سے پلٹ کر باہر چلی گئی۔ خورشید بلگرامی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دوسرے ہاتھ کے سہارے تھرتھراتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ باہر ہمت راؤ کے پکارنے سے وہ سمجھ گیا کہ اس کے سامنے ماجدہ نہیں روپ وتی نام کی کوئی عورت تھی مگر ماجدہ کا ایک ایک روپ چرا کر آئی تھی اور اس سے کہہ رہی تھی۔

"اباجان! اگر میں خودکشی نہ کرتی تو آج دوسری روپ وتی ہوتی۔ کیونکہ عورت ایک بار لٹتی ہے تو بار بار لٹنے کے راستے ہموار ہوتے جاتے ہیں۔ ایک بار آپ حوالات گئے۔ دوسری بار آپ کو مجھ سے دور کہیں اور پہنچا دیا جاتا۔ پیش آنے والے بعض حالات اتنے بے حیا ہوتے ہیں کہ انسان کو مجبوراً بے غیرت بننا پڑتا ہے۔

اس دنیا کے ہر ملک میں ہر شہر میں اور ہر دوسری تیسری گلی میں ایک روپ وتی ایک ماجدہ ہوتی ہے۔ اگر وہ ایک جگہ خودکشی کرلیتی ہے تو دوسری جگہ زندہ رہتی ہے۔ ہماری آپ کی تہذیب کو منہ چڑانے کے لیے سگریٹ کا دھواں پھونکتی رہتی ہے۔ اگر میں زندہ ہوتی تو آپ کیا کرتے؟ میرا گلا گھونٹ دیتے یا کلیجے سے لگا کر کالی تہذیب کے اندھیرے سے گزر جاتے؟ آپ جو کچھ بھی کرتے، وہی کر گزریں۔ میں ماجدہ، روپ وتی میں دوبارہ آگئی ہوں......"

اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دیکھا۔ وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ ماجدہ کی طرح گم ہوگئی تھی۔

اب اس دمدار ستارے کو دنیا والوں سے چھپا کر نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ ماہرین فلکیات نے تمام بڑے ممالک تک یہ رپورٹ پہنچا دی تھی کہ وہ دمدار ستارہ انٹرنیشنل ڈیٹ لائن کے ادھر ۲۱ دسمبر کی شام کو اور ڈیٹ لائن کے ادھر ۲۲ دسمبر کی شام کو چند سیکنڈ کے لیے

منظرِ عام پر آئے گا۔ پھر زمین کی گردش کے باعث نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔

اس رپورٹ کے پیشِ نظر پہلے تمام چھوٹے بڑے ممالک کے حکام کو خفیہ طور پر اطلاع دی گئی کہ اٹھائیس دسمبر کا دن اس دنیا کا آخری دن ہے۔ کسی کے زندہ بچ رہنے کی امید برائے نام ہے۔ یہ بات جس ملک کے بھی عوام کو معلوم ہوگی۔ وہاں فتنہ و فساد برپا ہوگا۔ لوگوں سے جنونی حرکتیں سرزد ہوں گی۔ لہٰذا پولیس اور فوج کو مستعد رہنے کا حکم دیا جاتے اور لوگوں کو قانون کا پابند بنا کر رکھنے کے لیے ہر ممکن تدابیر کی جائیں۔

۱۸ دسمبر تک تمام ممالک سر جوڑ کر سوچتے رہے اور منصوبے بناتے رہے۔ پھر تمام ممالک کے اخبارات کو ایک چھوٹا سا پیراگراف شائع کرنے کی اجازت دی گئی کہ ایک دمدار ستارہ زمین کی طرف آنے والا ہے۔ اس کے متعلق مزید تحقیقات کی جا رہی ہیں۔

عوام میں پہلے ہی ایک انجانی سی بے چینی پھیلی ہوئی تھی اس چھوٹی سی خبر نے ساری دنیا کو چونکا دیا۔ سرکاری طور پر اخبارات کو وہ خصوصی مضامین شائع کرنے سے نہیں روکا گیا۔ جن میں دمدار ستارے کے متعلق عام سی معلومات تھیں اور اس کی برسوں کی تاریخ بیان کی گئی تھی۔

بڑی احتیاط سے منصوبے بنانے کے باوجود ایک بھول ہو گئی۔ انہوں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ مولوی، پنڈت، پادری اور دوسرے مذہبی پیشوا قیامت کی دھمکیاں دیتے اور گناہگاروں کو لعن طعن کرتے منظرِ عام پر آ جائیں گے۔ ۲۰ دسمبر کو مسجدوں، مندروں اور گرجاؤں میں لوگوں کا ایسا بے پناہ ہجوم تھا کہ قیامت سے پہلے اب ان کے لیے نئی عبادت گاہیں تعمیر کرانے کا وقت گزر چکا تھا۔

مولویوں نے لوگوں سے پوچھا۔ "اب کیوں آئے ہو؟ اب خدا کیسے یاد آ رہا ہے؟ گناہ کے اندھیروں میں بھٹکنے والو اب تمہارا عبرتناک انجام تمہارے سامنے آ رہا ہے۔"

علمائے دین خاموش تھے۔ کیونکہ کتابوں میں قیامت کی جو نشانیاں بیان کی گئی ہیں، وہ اب تک ظاہر نہیں ہوئی تھیں صرف یہ بات کسی حد تک درست ہوتی نظر آ رہی تھی۔ کہ انسان سر سے پاؤں تک گناہوں میں ڈوب جائیں گے۔ زمین گناہوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکے گی۔ لیکن ابھی یہ زمین برداشت کر رہی تھی کیونکہ ماجدہ جیسی بے شمار لڑکیاں تھیں جو منہ چھپا کر دنیا والوں کو شرم و حیا کا مفہوم سمجھاتی تھیں۔ شنکر جیسے ان گنت نوجوان تھے، جو گناہگار باپ کے لیے اپنے دل کا خون کرتے تھے۔ محبوبہ کے رشتہ کو توڑ کر اپنے دل پر صبر کی سِل رکھ کر "ماتا جی پرنام" کہتے تھے۔

علمائے دین کا اپنا ایمان اور اعتقاد مستحکم تھا کہ قیامت اس طرح نہیں آئے گی جس طرح سائنسدان اسے اپنی دنیا میں لا رہے تھے۔ وہ محض اس لیے خاموش تھے کہ شاید اسی طرح لوگ اب بھی گناہوں سے توبہ کر لیں اور صراطِ مستقیم پر چل پڑیں۔

ان کے برعکس عیسائی مذہب کے بعض پیشوا دعوے کر رہے تھے کہ قیامت سے پہلے یعنی اٹھائیس دسمبر سے پہلے پچیس دسمبر کو حضرت مسیحؑ دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے۔ ان کی اس پیشین گوئیوں سے عوام میں کھلبلی مچ گئی۔ اہلِ اسلام بھی اسے تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ قیامت سے پہلے دنیا میں تشریف لائیں گے۔ لہٰذا بے شمار مسلمانوں نے بھی ان پیش گوئیوں کو تسلیم کر لیا۔ جب ایک شخص یقین سے کوئی بات کہتا ہے تو دوسرا سننے والا بڑی حد تک متاثر ہو جاتا ہے۔ بس اس طرح لوگوں میں اضطراب اس قدر بڑھ رہا تھا کہ اب تب میں کچھ ہونے ہی والا تھا۔

سرکاری طور پر اخبارات اور ریڈیو کے ذریعہ آہستہ آہستہ بڑی سہولت سے سمجھایا جا رہا تھا کہ دمدار ستارے سے نقصان پہنچنے کا صرف ایک فیصد خدشہ ہے۔ موجودہ معلومات کے مطابق ننانوے فیصد یقین ہے کہ ستارہ زمین سے نہیں ٹکرائے گا۔ وہ سمندر میں گرے گا۔

مگر لوگ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ یہ سب جھوٹی تسلیاں ہیں۔ وہ اخبارات میں معلوماتی مضامین پڑھ چکے تھے کہ دمدار ستارہ جسامت میں زمین سے کئی گنا بڑا ہے۔ وہ صرف سمندر میں نہیں خشکی پر بھی گرے گا۔ اب لوگ اپنے اپنے گھروں میں کئی مہینوں کا راشن جمع کرنے لگے تاکہ دمدار ستارے کے ٹکرانے کے دوران اور اس سے کسی طرح بچ جانے کے بعد بھوکوں نہ مرنا پڑے۔

ایک طرف تو بازاروں میں ضروری چیزوں کی خرید و فروخت بڑھ گئی تھی۔ دوسری طرف اسٹاک ایکسچینج میں تعطل پیدا ہو رہا تھا۔ مال کا اسٹاک کوئی نہیں خرید رہا تھا۔ کاروباری دستاویزات بھی گروی نہیں رکھے جا رہے تھے۔ بڑی بڑی کمپنیوں نے نرخ گرا دیے تھے۔ اس کے باوجود کوئی شیئر نہیں خرید رہا تھا۔ تیسری طرف حکام بھی غلطیاں کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے تخریب کو سامنے دیکھ کر تعمیراتی منصوبے روک دیے تھے۔ اس طرح بڑے بڑے سرمایہ دار کیوں پیچھے رہتے۔ انہوں نے نئی اور ترقی پذیر صنعتوں میں سرمایہ لگانے سے ہاتھ روک لیا۔

۲۱ اور ۲۲ دسمبر کی شام کو آفتاب غروب ہونے کے ایک منٹ بعد وہ دمدار ستارہ ایک سرخ نقطہ کی طرح مغربی افق پر نظر آیا پھر چند سیکنڈ کے بعد نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اسے کسی نے دیکھا، کسی نے نہیں دیکھا۔ کیونکہ عام لوگوں کو پہلے سے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ فلاں تاریخ کی شام کو نظر آ سکتا ہے۔ اس لیے جس نے

اتفاق سے دیکھا، اس نے چیخ کر دوسرے کو بتایا۔ دوسرے نے تیسرے کو دکھایا لیکن وہ ستارہ محدود لوگوں کی نظروں میں آ کر اوجھل ہو گیا۔

بہرحال بہت کم لوگوں نے دیکھا مگر بہت زیادہ لوگوں نے یقین کیا۔ کیونکہ حالات ایسے تھے کہ ایسی باتوں کو صحیح مان لیا جاتا تھا۔ پھر ہاتھ کنگن کو آرسی والی بات تھی کہ آج شام نظر آیا تھا تو کل شام کو بھی نظر آئے گا اور کل زیادہ دور نہیں ہے۔

لہٰذا ۲۳ دسمبر کی شام بہت اہم ہو گئی۔ وہ ساری دنیا کو یقین دلانے والی شام تھی کہ موت اٹل ہے۔ چونکہ موت کا کوئی رشتہ دار نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ کس کے ساتھ مروت سے پیش نہیں آئے گی۔ سب کو اپنی لپیٹ میں لے گی۔ اس شام پتہ نہیں کیا کچھ ہونے والا تھا۔ اس سے پہلے ہی مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ سڑکوں اور بازاروں میں مسلح فوجی گشت کرنے لگے۔ کہیں بھی دو آدمیوں سے زیادہ کھڑے ہونے یا ساتھ چلنے کی ممانعت کر دی گئی۔ حکومتوں اور بنکوں نے قرضہ اسکیم بند کر دینے کا اعلان کیا۔ صرف چیک کے ذریعہ محدود رقم نکالنے کی اجازت تھی۔ اسٹاک ایکسچینج بالکل ہی بند کر دیا گیا۔

شام تک سب لوگ پریشان رہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور جو ہو رہا تھا وہی تمام لوگوں کو خوفزدہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔ جب شام ہوئی تو کوئی گھر ایسا نہ تھا جس کی چھت پر مردوں اور عورتوں کی بھیڑ نہ لگی ہو۔ سڑکوں پر، پارکوں اور باغوں میں لوگ دو دو کی تعداد میں دور دور کھڑے ہوئے تھے۔ سب کی نظریں مغربی افق پر جمی ہوئی تھیں۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ دن کا آخری اجالا دم توڑ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سب ہی کے دل دھڑک رہے تھے۔

آفتاب غروب ہو گیا۔ تاریکی پھیل گئی۔ پچھلی شام سب نے سنا تھا کہ وہ نقطے کے برابر تھا۔ کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اب وہ جسامت میں ٹینس کی گیند کے برابر ہو چکا ہوگا۔ جب وہ افق سے نمودار ہوا تو دنیا کی ساری آوازیں مر گئیں۔ ایکدم سے سناٹا چھا گیا۔ دمدار ستارے کی کوئی مخصوص شکل نہیں تھی۔ بس وہ آگ کا گولا نظر آ رہا تھا۔ تمام ماحول یوں گرم ہو گیا جیسے وہ دمدار ستارہ آنچ دے رہا ہو۔ لوگوں کے نتھنوں سے گرم گرم سانسیں نکل رہی تھیں۔ انسان، مکان، درخت، پھول پودے سب ہی ہلکی ہلکی سرخ روشنی میں نہا گئے تھے۔ وہ لہو رنگ روشنی بے شمار کانوں میں آسیبی سرگوشی کر رہی تھی۔ دماغوں کے چور حصوں میں موت کی چٹکی لے رہی تھی۔

تب ایک بوڑھا چیخنے لگا۔ ایک عورت قہقہے لگانے لگی۔ یہاں سے وہاں تک ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا۔ سناٹا ختم ہو چکا تھا۔ انسانی حیات کے قہقہے اور فریادیں گونج رہی تھیں۔ کہیں کوئی کسی کو پتھر پھینک پھینک کر مارنے لگا۔ کہیں کسی نے خود ہی پتھر سے سر ٹکرا لیا۔ ایک نوجوان نے جنونی انداز میں ایک لڑکی کو پکڑ کر سینے سے لگا لیا۔ اور اسے چومنے لگا جھنجھوڑنے لگا۔ لڑکی چیخ رہی تھی۔ ایک نے دوسرے سے چیخ کر کہا۔ "میں تمہیں قرض معاف کرتا ہوں"۔ ایک نے وہسکی کی بوتل کھول کر منہ سے لگا لی بس یہی ایک لمحہ رہ گیا ہے۔ جتنی بھی شراب حلق سے اتر جائے جتنی بھی پیاس بجھ جائے۔

دور دور تک اذان کی آوازیں گونجنے لگیں۔ مندروں اور کلیساؤں کے گھنٹے بجنے لگے۔ مگر ہر آواز میں قیامت کی یقین دہانی تھی، خوف تھا، دہشت تھی۔ خالقِ کائنات نے انسانی دماغوں کی ایک ہلکی سی چٹکی لی تھی اور دماغ بے دماغ ہو گئے تھے۔ جب ہزار جتن کے باوجود موت ٹلتی نہیں۔ زندگی ٹھہرتی نہیں تو انسان بے بسی کے عالم میں وہی کرتا ہے، جو نہیں کرنا چاہتا۔ چیخنا نہیں چاہتا مگر چیختا ہے ہنسنا نہیں چاہتا مگر ہنستا ہے۔ اس وقت انسانی بے بسی کا یہی عبرتناک تماشہ تھا، کوئی جنونی انداز میں چیخ رہا تھا کوئی کسی کو چوم رہا

بولنے کا وقت

مرکزی اسمبلی کے ایک نامور رکن اجلاس میں شرکت کی غرض سے ہانپتے کانپتے اسمبلی کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ وقت ہو چکا تھا اور سب اراکین اپنی اپنی نشستوں پر پہنچ چکے تھے۔ کارروائی شروع ہونے میں چند ہی سیکنڈ باقی تھے۔ ہمارے یہ نامور رکن ہال کے دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ گیلری میں چھپا ہوا صحافی بجلی کی سی تیزی سے اُن کی طرف لپکا اور راستہ روک کر بولا:

"جنابِ والا! آپ کا کیا خیال ہے کہ...."

نامور رکن نے انہیں راہ میں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "یہ وقت خیال کرنے یا سوچنے کا نہیں صرف بولنے کا ہے۔ میری راہ سے ہٹ جائیے۔ میں اسمبلی میں بولنے کی غرض سے جا رہا ہوں۔"

مرسلہ: رفیق طاہر، شیخوپورہ

تھا کسی سے لڑ رہا تھا، ناچ رہا تھا، قلا بازیاں کھا رہا تھا، نفرت عداوت، محبت، جوش، جذبہ اور جنون کیا کچھ نہ تھا۔ اتنا کچھ تھا کہ انسان اپنی بوٹیاں آپ نوچ رہا تھا۔

رات کی تاریکی میں وہ جلتا بجھتا ہوا ستارہ ذرا دیر کے لیے نمودار ہوا۔ پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی لوگ قدرے پُرسکون ہو گئے۔ اور خاموشی سے یوں ہانپنے کانپنے لگے جیسے بوٹ کے پہلے راؤنڈ میں لڑنے کے بعد اب دوسرے راؤنڈ کے لیے سانسیں درست کر رہے ہوں۔

سب کے تصور میں وہ ستارہ تھا، جو کالے آسمان کے پھیر سے پُرغضبناک کانے کی طرح ایک آنکھ سے دیکھ کر اور یہ سمجھا کر گزر گیا تھا کہ..... ”کانا دجّال آ گیا ــــ آ گیا۔“

کرسمس نائٹ بڑی رنگین اور سنگین تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے دن دنیا کے تمام عیسائی خوشیاں مناتے ہیں، گرجاؤں میں تھوڑی دیر کے لیے فرض ادا کر لیے جاتے ہیں، پھر رنگ رلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ہر گھر اور ہر محفل میں آرکسٹرا موسیقیت سناتے ہیں اور شراب اور شباب آپس میں گلے مل کر رقص کرتے ہیں۔

لیکن وہ اس دنیا کی آخری کرسمس نائٹ تھی۔ دنیا والوں کو انتظار تھا کہ اس رات حضرت عیسیٰؑ دوبارہ تشریف لانے والے ہیں۔ مذہبی راہنماؤں کی پیش گوئیوں کے مطابق تمام ممالک نے ایک دوسرے سے رابطہ قائم کر رکھا تھا کہ جس ملک میں بھی مسیحؑ تشریف لائیں وہاں سے انہیں فوراً ہی مواصلاتی سیارے کے ذریعہ ساری دنیا میں ٹیلی کاسٹ کیا جائے۔ اور ریڈیو کے ذریعہ ان کے پیغامات نشر کیے جائیں تاکہ تمام دنیا کو یقین ہو جائے کہ عیسائی مذہب ہی واحد آخری اور ہمہ گیر مذہب ہے جس کے سائے میں لوگ قیامت سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

بہاما جزیرے کے ریکریشن ہال میں شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ آرکسٹرا چیخ رہا تھا، ہنستی کھلکھلاتی ہوئی جوانیاں موسیقی کے سُر تال پر تھرک رہی تھیں۔ حسن تھا، شباب تھا، نشہ تھا اور دعوتیں تھیں کہ آؤ اور ہمیں لوٹ لو۔ بے خبر کیا خبر کہ کل یہ دنیا رہے یا نہ رہے۔

ریکریشن ہال کے ایک کاؤنٹر پر بڑا سا ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ اس وقت دنیا کے تمام ٹی وی اسکرین روشن تھے۔ اور ریڈیو سے خصوصی پروگرام نشر کیے جا رہے تھے۔ رات کے بارہ بج کر ایک منٹ پر اچانک ہی آرکسٹرا تھم گیا۔ ریڈیو کے ذریعہ خوشخبری سنائی جا رہی تھی کہ مسیحؑ مصلوب اس دنیا میں تشریف لا چکے ہیں۔ اٹلی کے شہر روم میں ان سے رابطہ قائم کرنے اور انہیں ٹیلی کاسٹ کرنے کے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ دنیا کے تمام لوگ بہت جلد انہیں ٹی وی اسکرین پر دیکھ سکیں گے اور اُن کی تعلیمات سے فیض حاصل کر سکیں گے۔

یہ خبر سنتے ہی ایک یہودی نے شراب سے بھرا ہوا جام کھینچ کر ریڈیو پر مارا۔ پھر چیخ کر بولا۔

”یہ کیا بکواس ہے۔ اس زمین سے دُمدار ستارہ ٹکرائے گا۔ آسمانی کتابوں والی قیامت نہیں آ رہی ہے۔ پھر یہ لوگ کون سے مسیحؑ کو دوبارہ زندہ کر کے ٹی وی اسکرین پر لا رہے ہیں؟“

دوسرے یہودی نے تائید کی۔ ”ہاں، یہ عیسائی لوگ موقع پرست ہوتے ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے پیغمبر کی ڈمی پیش کر رہے ہیں۔“

”یو شٹ اپ۔“ ایک عیسائی نے کہا۔ ”تم تمام عیسائیوں کی توہین نہیں کر سکتے۔ سب ہی موقع پرست نہیں ہوتے۔ اگر یہ لوگ شہر روم سے کسی مسیح کو ٹیلی کاسٹ کرنے والے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ رومن کیتھولک فرقہ سے تعلق رکھنے والوں کی شرارت ہے۔“

ایک رومن کیتھولک فرقہ سے تعلق رکھنے والا شراب کے نشہ میں لڑکھڑاتا ہوا نظر آیا۔ پھر بولنے والے کے منہ پر ایک زور کا تھپڑ مارتے ہوئے بولا۔

”یو سن آف اے بچ۔ اگر تم نے میرے فرقہ کے خلاف اور پاپائے روم کے خلاف کچھ کہا تو.....“

بات پوری ہونے سے پہلے ایک یہودی نے اس کے منہ پر گھونسہ جڑ دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ فرقہ وارانہ فساد کا آغاز ہو گیا۔ عورتیں خوفزدہ ہو کر چیخنے اور بھاگنے لگیں۔ مرد ایک دوسرے کی حمایت میں دیوانے ہو گئے تھے۔ جو چیز ہاتھ میں آ رہی تھی، پھینک کر مار رہے تھے۔ وہاں یہودیوں اور عیسائیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ایک ہندو ہمّت راؤ تھا، وہ روپ وتی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا ہال سے باہر بھاگ گیا۔ ایک مسلمان اور ایک بُدھسٹ تھے۔ وہ دونوں شروع سے ہی ان لوگوں سے دور اپنے کاٹیج میں وقت گزارتے تھے۔ اور مادام کی تیمارداری میں مصروف رہتے تھے۔

مادام فلیچر کا آخری وقت آ پہنچا تھا۔ ساری دنیا کے لوگ اپنی باقی ماندہ سانسیں انگلیوں پر گن رہے تھے۔ ایسے وقت ایک بوڑھی عورت کی موت کا افسوس کون کر سکتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے بہو اور لاڈلی پوتی سے دور اکھڑی اکھڑی سانس لے رہی تھی۔ ایک طرح سے وہ خوش نصیب تھی کہ اپنے خون کے رشتوں اور خاندان کے افراد کی موت کا بھیانک تماشہ دیکھنے سے پہلے مر رہی تھی۔

ہاتورا نے پوچھا۔ ”کیا میں ڈاکٹر کو بلا کر لاؤں؟“

خورشید بلگرامی نے ہاتورا کو مایوسی سے دیکھا۔ اس کی خاموش نظریں کہہ رہی تھیں کہ ڈاکٹر کو بلانا بیکار ہے لیکن اس نے مادام کی تسلی کے لیے کہا۔ ”ہاں بلا کر لے آؤ۔“

مادام نے کمزور سی آواز میں کہا۔

”نہیں، مت جاؤ۔ ہاتورا میرے پاس رہو۔“

اتنا کہتے کہتے وہ تھک گئی۔ پھر گہری گہری سانس لیتی ہوئی بولی۔

”خورشید! ہم اپنا ماتھا نہیں دیکھتے۔ اس کے باوجود آخری وقت تقریباً ہر انسان کو اپنے آخری وقت کا پتہ چل جاتا ہے۔“

”ہاں پتہ چل جاتا ہے۔“ خورشید بلگرامی نے تائید کی۔

”یہ ہوائیں شور کیوں مچا رہی ہیں۔ کیا قیامت چیختی چنگھاڑتی آ رہی ہے؟“

”نہیں مادام! یہ سمندری ہوائیں ہیں۔ روز ہی شور مچاتی ہیں۔“

”جھوٹ نہ بولو۔ دیکھو۔ سنو۔ لوگ شور مچا رہے ہیں۔“

”یہ آواز ریکریشن ہال سے آ رہی ہے۔ پتہ نہیں وہ لوگ کیوں شور مچا رہے ہیں۔“

”خورشید! تم سے التجا کرتی ہوں۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔ بتاؤ تمہارا موجودہ حساب کیا ہے؟ چپکے سے میرے کان میں کہہ دو میں تمہارے حساب کے نتائج کو اپنے سینے میں دفن کر کے مر جاؤں گی۔ دیکھو جھوٹ نہ بولنا.....“

خورشید بلگرامی ذرا دیر کے لیے شش و پنج میں رہا۔ پھر اس نے مادام کے کان کے پاس جھک کر کہا۔

”آپ کا بیٹا، آپ کی بہو اور آپ کی پوتی لارا انشاء اللہ موجودہ قیامت کے بعد بھی زندہ رہیں گے۔ جب تک انسان بے شرمی، بے غیرتی کے نتائج میں پیدا ہونے والے مصائب کو ٹالنے کے لیے محبت، حیا اور عبادات کا صدقہ اتارتا رہے گا۔ قیامت نہیں آئے گی۔ نماز اور نیکی کا پلڑا آج بھی اتنا بھاری ہے کہ بے غیرتوں کو چونکانے کے لیے شرم دار پر چڑھ جاتی ہے اور گناہگار پچھتاوے کے بعد دل سے سر پھوڑتے اور خداوند کریم کے حضور توبہ کرتے ہیں۔ جب تک ہماری دنیا میں یہ خوبصورتی ہے۔ یہ دنیا فنا نہیں ہو گی۔“

مادام نے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”خورشید! تم ہمیشہ دو نجومیوں کی طرح بول رہے ہو مگر میں سمجھ گئی ہوں کہ سچ وہ ہے جو تم نہیں بول رہے ہو۔ اب میں کچھ نہیں پوچھوں گی۔ مجھے ــــ آخری بار ــــ مجھے آخری بار میری لارا کی آواز سنا دو۔“

خورشید بلگرامی اور ہاتورا دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ پھر ہاتورا نے اسے سہارا دے کر اپنے بازو اور شانے سے ٹیک لگا کر آرام سے بٹھا دیا۔ خورشید بلگرامی نے گڑیا کو چابی دے کر فرش پر چھوڑ دیا۔

وہ رینگنے لگی تو دادی نے ایک ہچکی لی۔ پوتی نے کہا۔ ”ٹوِنکل ٹوِنکل لٹل اسٹار.....“

اُبلا ہوا انڈا

جدید آرٹ کی نمائش تھی، ایک شخص دیر سے ایک تصویر کے سامنے کھڑا تھا۔ آرٹسٹ کو دیکھ کر تحسین بھرے لہجے میں بولا:

”بہت خوب..... کتنی جاندار تصویر بنائی ہے آپ نے میرے منہ میں تو پانی بھر آیا ہے اُسے دیکھ کر۔“

آرٹسٹ: ”جی؟ غروبِ آفتاب کا منظر دیکھ کر آپ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کیوں۔“

”خدا کی پناہ! غروبِ آفتاب کا منظر! میں تو اسے اُبلا ہوا انڈا سمجھ رہا تھا۔“

مرسلہ: ظہیر الدین شاہ، چکوال

ستاروں کی چالیں سمجھنے والی دادی نے دوسری ہچکی لی۔ پوتی نے سر اٹھا کر پوچھا۔ ”ہاؤ آئی ونڈر وہاٹ یو آر؟“

واقعی تعجب کی بات ہے۔ اتنی عمر گزارنے کے بعد بھی بچوں کے سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ستارے کیا ہیں؟ بچوں کی طرح دادی کی آنکھیں بھی حیرانی سے پھیل گئیں۔ اس نے آخری ہچکی لی۔ پھر ہاتورا کے شانہ پر اس کا سر ڈھلک گیا۔

لارا کو دیکھنے اور اسے سینے سے لگا کر چومنے سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ صرف گڑیا بول رہی تھی۔ وہاں سے بہت دور لارا ابھی بول رہی ہو گی۔ یہ سمجھے بغیر کہ اس کی دادی نہیں سن رہی ہے۔ سمندری ہوائیں ماتمی آواز میں شور مچاتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی اور کچھ ہونے والا ہے۔ ابھی اور بھی قیامتیں ٹوٹنے والی ہیں۔ خورشید بلگرامی نے آگے بڑھ کر مادام کی کھلی ہوئی آنکھیں بند کر دیں۔

اتنے میں کاٹیج کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ روپ وتی بدحواسی میں بھاگتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہمّت راؤ تھا۔ وہ سیدھی بھاگتی ہوئی خورشید بلگرامی کے پاس آئی۔ پھر اس سے لپٹ کر بولی۔

”مجھے بچاؤ۔ اس درندے سے بچاؤ۔ یہ میری عزت سے کھیلنا چاہتا ہے۔“

خورشید بلگرامی کا دماغ گرم ہو گیا۔ ماجدہ اس کی سماعت میں چیخ رہی تھی۔ ”ابا جان! مجھے میری امی سے بچائیے مجھے ملک مختار

سے بچاتیے۔ میری عزت خطرے میں ہے۔"

ہمت راؤ نے ریوالور نکال کر اُس کا رُخ خورشید بلگرامی کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"مسز خورشید! ہمارے درمیان نہ آؤ۔ یہ بازاری عورتوں سے بھی بدتر ہے۔ اب تک نہ جانے کہاں کہاں اپنی عزت لُٹا چکی ہے۔ میں جب بھی اس کی جوانی تک پہنچنا چاہتا ہوں، یہ مجھے اُلّو بنانا شروع کر دیتی ہے۔"

روپ وتی نے خورشید بلگرامی کو جھنجوڑ کر کہا۔

"یہ جھوٹ بولتا ہے۔ بھگوان کی سوگند میں نے کبھی اپنی خوشی سے اپنی عزت کو کھلونا نہیں بنایا۔ اگر میں ویشیا ہوتی تو عزت بچانے کے لئے بھاگ کر یہاں نہ آتی۔"

ہمت راؤ کے قدموں کے پاس گڑیا فرش پر خاموش تھی۔ شاید اُس کے اندر کی اسپرنگ پھنس گئی تھی۔ وہ چُپ چاپ سر اٹھائے ستاروں کو دیکھنے کے بجائے ریوالور کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک ہی اُس کی اسپرنگ کام کرنے لگی۔ آواز اُبھرنے لگی۔ "ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار۔۔۔۔"

ہمت راؤ نے پہلے گڑیا کو نہیں دیکھا تھا۔ اچانک ہی قدموں کے پاس سے آواز آئی تو وہ گھبرا کر اچھل پڑا۔ اُسی وقت خورشید بلگرامی نے اس کے ریوالور پر ٹھوکر مار دی۔ ٹھائیں ٹھائیں۔ ریکریشن ہال سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ روپ وتی نے فرش پر سے ریوالور اور گڑیا کو اٹھا لیا تھا۔ خورشید بلگرامی ہمت راؤ کو نیچے گرا کر اس کے منہ پر مکّے رسید کرتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"شیطان کے بچّو! اگر آج میری بیٹی زندہ ہوتی تو لوگ اُسے بھی طوائف کہہ کر ذلیل اور رسوا کرتے رہتے۔ ایک تو تم خود ہی عزت لوٹتے ہو۔ دوسرے یہ کہ ان مظلوم عورتوں کو عزت سے زندگی گزارنے کا حق نہیں دیتے۔ میں تمہیں مار ڈالوں گا ہمت راؤ۔ میں تمہیں مار ڈالوں گا ملک مختار۔۔۔۔۔"

ماتورا نے پیچھے سے آکر خورشید بلگرامی کو پکڑ لیا۔ پھر اسے کھینچتا ہوا دُور لے گیا۔ ہمت راؤ بیہوش ہو گیا تھا۔ اس کے منہ پر جتنے گھونسے پڑے تھے۔ اتنے ہی طمانچے روپ وتی کے منہ پر پڑتے رہے تھے۔ وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ ہمت راؤ سے بچنے کے لیے وہ خورشید بلگرامی سے آکر ڈرامائی انداز میں لپٹ جائے گی۔ تو وہ جوشیلے انداز میں ہیرو بن کر اپنی ہیروئن کے لیے سینہ سپر ہو جائے گا۔ لیکن وہ باپ بن کر اس کے لیے لڑ رہا تھا۔ اس کے دل پر گھونسے مار رہا تھا۔ اور اس کے دماغ کو مقدس رشتوں کی سوچ بتا رہا تھا۔

روپ وتی ذرا دیر کے لیے اپنے اندر ایک ننھی سی بچّی بن گئی اس نے گڑیا کو بے اختیار سینے سے لگا لیا۔ اس سمے یوں محسوس ہوا۔ جیسے کوئی اسے بھی سینے سے لگا کر اپنی پناہ میں لے رہا ہو۔ اسے ہوس بھری نگاہوں سے بچا رہا ہو۔ ہاں یہی تحفظ تو اسے نہیں ملا تھا اپنے ہی سگے باپ۔ جنا اس کی سوچ میں زہر بھر دیا تھا کہ جب اپنی آبرو پر قیامت ٹوٹتی ہے تو اپنا باپ بھی اپنا محافظ نہیں ہوتا۔

اچانک ہی روپ وتی نے خورشید بلگرامی کو گھور کر دیکھا۔ وہ خود کو ماتورا کی گرفت سے چھڑا کر پھر ہمت راؤ کو مارنے کے لیے جا رہا تھا۔ وہ للکار کر بولی۔

"خبردار! ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا۔ ورنہ گولی مار دوں گی۔"

خورشید بلگرامی نے ٹھٹھک کر اسے حیرانی سے دیکھا۔ پھر پوچھا۔

"کیا تم پاگل ہو؟ اپنی عزت کے دشمن کو بچانے کے لیے مجھ پر گولی چلاؤ گی؟"

"اگر دنیا کے کسی مرد پر بھروسہ نہ کرنا پاگل پن ہے تو میں پاگل ہوں۔ تمہاری باتوں سے میں نے سمجھ لیا ہے کہ تم ایک بیٹی کی بے آبروئی کا زخم کھا چکے ہو۔ اس لیے مجھے عاشق کی نظروں سے نہیں دیکھو گے اور مجھے باپ کی نظروں سے خوف آتا ہے۔"

اچانک ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ ہاتھ میں ریوالور کانپنے لگا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"سنو خورشید! ہم زندگی کے اس موڑ پر مل رہے ہیں۔ جہاں مقدس رشتوں پر پہلے ہی قیامت ٹوٹ چکی ہے۔ میں ایک عورت ہوں۔ مجھ میں بھی اتنی شرم تھی کہ ایک بار عزت لٹنے کے بعد آتما ہتیا (خودکشی) کر لیتی۔ مگر جو قیمتی چیز میرے اندر سے مر چکی تھی۔ اس کے بعد میں اپنے شریر (جسم) کو کیا مارتی؟ میں تو زندہ ہوں۔ ان لوگوں کو مارنے کے لیے جنہوں نے مجھے مار ڈالا۔

میں انہیں مارتی ہوں۔ مگر زندہ رکھتی ہوں۔ جیسے تم اس ہمت راؤ کو دیکھ رہے ہو۔ یہ ہوش میں آنے کے بعد پھر مجھ پر مرے گا۔ یہ نہ سمجھو کہ میں کمزور ہوں اور اپنے بچاؤ کے لیے تمہارے پاس آئی ہوں۔ نہیں میں کچھ اور سوچ کر آئی تھی۔ تم کچھ اور نکلے۔ میں تمہیں پہلی اور آخری بار سمجھاتی ہوں کہ مجھے بیٹی نہ کہنا۔ میرے لیے اس سے بڑی کوئی گالی نہیں ہے۔ میں اس دنیا کی تمام بہنوں اور بیٹیوں کی طرف سے پوچھتی ہوں کہ ان کی عزت آبرو کے لیے اور ان کی سلامتی کے لیے تمہاری تہذیب ایسا گلوب آرک کیوں نہیں بناتی؟

ٹھیک ہے کہ تم مجبور ہو۔ میں مانتی ہوں۔ تم مجبور نہ ہوتے تو آج تمہاری بیٹی زندہ رہتی لیکن میں مجبور نہیں ہوں۔ میں زندہ رہوں گی۔ اگر اس گلوب آرک میں اپنے مسلمان باپ کے ساتھ نہیں جا سکوں گی تو اپنے ہی دھرم کے یار کے ساتھ جاؤں گی۔۔۔۔۔"

یہ کہہ کر وہ ہمت راؤ کے پاس گئی۔ اور اسے سہارا دے کر اٹھانے لگی۔ وہ ہوش میں آ رہا تھا۔

❦

تمام اسلامی ممالک میں کہرام مچ گیا۔ عالمانِ دین احتجاج کرنے لگے کہ ایک ستارہ اگر زمین سے ٹکرانے والا ہے تو اس کا مطلب وہ قیامت نہیں ہے جس کا ذکر آسمانی کتابوں میں ہے لہٰذا ان حالات میں حضرت عیسیٰؑ کے نازل ہونے کی بات کی جا رہی ہے تو یہ سراسر فراڈ ہے۔

یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آ رہی تھی کہ عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ایک سوچا سمجھا مذہبی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے تاکہ اس دنیا کے آخری چند دنوں میں تمام لوگ ایک پیغمبر کی ڈمی دیکھ کر عیسائیت پر ایمان لے آئیں۔ اگر دُمدار ستارے کے ٹکرانے کے بعد بھی دنیا سلامت رہے گی تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ واقعی حضرت عیسیٰؑ تشریف لا چکے تھے اور اگر دنیا تباہ ہو جائے گی تو ڈرامہ کھیلنے والوں کو سزا دینے کے لیے کوئی باقی نہیں بچے گا۔

مارشل لا کے باوجود کثیر تعداد میں مسلمان سر سے کفن باندھ کر میدان عمل میں آ گئے تھے۔ آنسو گیس، لاٹھی چارج، فائرنگ کی گونج میں دل ہلا دینے والے نعرے گونج رہے تھے کہ جان دے دیں گے۔ مگر کلام پاک میں قیامت کی جو نشانیاں پیش کی گئی ہیں۔ ان نشانیوں کو غلط انداز میں پیش کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

صبح تک ہنگامے ہوتے رہے۔ فوج کے سپاہی امن و امان قائم رکھنے کی کوششیں کرتے رہے۔ ۲۵ دسمبر کی صبح اچانک ہی ہنگامے سرد پڑ گئے۔ ریڈیو سے خبریں سنائی جا رہی تھیں کہ اٹلی میں زبردست زلزلہ آیا ہے جہاں بہت سی عمارتیں گری ہیں۔ وہاں وہ ٹی وی اسٹیشن بھی کھنڈر بن گیا ہے۔ جہاں سے ایک پیغمبر کی ڈمی ٹیلی کاسٹ کی جانے والی تھی۔ پاپائے روم کا بیان نشر کیا جا رہا تھا کہ عیسائیوں کے کسی بھی فرقہ اور کسی بھی کلیسا سے یہ نہیں کہا گیا کہ مسیحؑ مصلوب اس دنیا میں تشریف لا چکے ہیں۔ یہ خبر کسی خفیہ ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی ہے۔ وسیع پیمانے پر تحقیقات کی جا رہی ہیں کہ کلیسائے روم کو بدنام کرنے کی سازش کون کر رہا ہے۔ پھر دبے لفظوں میں یہودیوں پر شبہ ظاہر کیا گیا۔

اس روز تمام گھروں اور بازاروں کے ریڈیو کھلے رہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں چونکا دینے والی خبریں نشر کی جا رہی تھیں۔ گیارہ بجے کی خبروں سے پتہ چلا کہ بڑے بڑے ممالک کی فوجیں آپس میں لڑ پڑی ہیں پھر یہ انکشاف ہوا کہ مختلف ممالک کی فوج کے یہودی سپاہی اور افسران، ہوائی اڈوں، بحری جہازوں اور آبدوز کشتیوں پر قبضہ جماتے بیٹھے ہیں۔ شمالی امریکہ کے ایک جنوبی جزیرے پاہاما میں ایک گلوب آرک تیار کیا گیا ہے وہاں بھی یہودیوں کی تعداد زیادہ ہے۔

دوپہر کو خصوصی پروگرام کے لیے ٹی وی اسٹیشن کھل گئے اسکرین پر ان۔۔۔ بڑے ممالک کے فوجی افسران کے انٹرویو پیش کیے جا رہے تھے جنہیں گلوب آرک جیسے اہم منصوبوں میں شریک نہیں کیا گیا تھا وہ کہہ رہے تھے۔

"اب سے چار ماہ بیس دن پہلے خفیہ اجلاس میں کہا گیا تھا کہ اپنی دنیا کو بچانے کے لیے بحری جہاز اور آبدوز کشتیاں کھلے سمندروں میں پھیل جائیں گی۔ فضائیہ کے افسروں نے یقین دلایا تھا کہ وہ اپنی دنیا کی سلامتی کے لیے فضا میں ہی دُمدار ستارے سے ٹکرا جائیں گے۔ خلائی سپیشنوں سے دور مار راکٹ سے حملے کریں گے تاکہ وہ ستارہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین تک پہنچنے سے پہلے بکھر جائے۔ بحری فوج کے افسران بھی کھلے سمندروں میں یہی فرض ادا کرنے والے تھے۔

پھر رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ اندر ہی اندر گہری سازش ہو رہی ہے۔ بّری فوج میں یہودی برائے نام ہیں وہاں صرف عیسائی رکھے گئے ہیں۔ کیونکہ انہیں زمین پر رہنا ہے۔ فضائی اور بحری فوج میں زیادہ سے زیادہ یہودی ہیں کیونکہ وہاں ان کی سلامتی ممکن ہے۔ گلوب آرک میں ایسے مسلمان، ہندو اور عیسائیوں کو مجبوراً جگہ دی جا رہی ہے، جن کی زندگی نئی دنیا کے لیے اہم ہے۔"

انٹرویو کے بعد ایک معاون انجینئر کو اسکرین پر پیش کیا گیا جس نے گلوب آرک کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ اس نے کہا۔

"ہم سب کو گلوب آرک کے متعلق صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ وہ جنگی مقاصد کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ ہم نے یقین کر لیا کیونکہ اس وقت تک ہم دُمدار ستارے کی آمد سے بے خبر تھے۔ پاہاما جزیرے میں کام کرنے کے دوران ہمیں ہر طرح کی آزادی تھی لیکن وہاں کاٹیج نمبر ایک کے تین قیدیوں سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کون تھے۔ کاٹیج کے اطراف مسلح سپاہیوں کا سخت پہرہ رہتا تھا۔"

اس کے بعد دنیا کے سب سے دولت مند یہودی کا نے ہیرالڈ موس کے سیکریٹری کو اسکرین پر پیش کیا گیا۔ اس کا حلیہ بتا رہا تھا۔ کہ اس پر بہت زیادہ تشدد کیا گیا ہے اور بہت زیادہ اذیتیں پہنچا کر حقیقت اگلوائی گئی ہے۔ اس نے کہا۔

"میرے باس ہیرالڈ موس اور ہمارے یہودی پیشواؤں اور رہنماؤں نے بڑے زبردست منصوبے بنائے ہیں کہ اگر یہ دنیا تباہ ہو جائے گی تو زمین کے باقی ماندہ حصوں میں نئے سرے سے یہودی مذہب کس طرح قائم کیا جائے گا۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ قیامت کا چرچا ہو رہا ہے تو ابھی سے عیسائی مذہب کی جڑیں کھوکھلی کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ آسمانی کتابوں کی پیش گوئی کے مطابق اعلان کیا جائے کہ حضرت عیسیٰؑ تشریف لا رہے ہیں۔ ان سے

رابطہ قائم ہونے کے بعد انہیں ٹیلی کاسٹ کیا جائے گا۔ اور جہاں سے ٹیلی کاسٹ کیے جانے کی بات کہی جائے گی، اس ٹی وی اسٹیشن کو بارودی دھماکوں سے تباہ کر دیا جائے گا تاکہ دنیا والوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کے اعلان میں صداقت ہوتی تو سچے مسیح اس ٹی وی اسٹیشن کے ساتھ نابود نہ ہوتے۔

ہمیں توقعات سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ ہم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ تمام مسلمان عیسائیوں کے خلاف ہو جائیں گے۔ یہ ہمارے حق میں بہتر ہوا۔ پھر اس سے پہلے کہ بارودی دھماکے ہوتے وہاں زلزلہ آگیا۔ ٹی وی اسٹیشن تباہ ہو گیا۔ ایسی صورت میں عیسائی پیشوا لاکھ یہ کہتے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو پیش کرنے کا منصوبہ نہیں بنایا تھا تو کوئی یقین نہ کرتا۔ سب یہی سوچتے کہ ٹی وی اسٹیشن کے ساتھ ایک پیغمبر کی ڈمی تباہ ہو گئی ہے۔ اس لیے اب باتیں بنائی جا رہی ہیں۔

باتیں ہم بنا رہے تھے اور بڑی رازداری سے بنا رہے تھے۔ پھر پتہ نہیں کیسے یہ راز فاش ہو گیا۔ میں بے قصور ہوں۔ میں تو صرف سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اب میں وہ فائل کھولتا ہوں، جن میں ان اہم افراد کے نام ہیں، جنہیں نئی دنیا آباد کرنے کی غرض سے زبردستی اغوا کیا گیا ہے۔"

وہ فائل کھول کر افراد کے اور ان کے ممالک کے نام پڑھنے لگا۔ جہاں سے وہ اغوا کیے گئے تھے۔ جب ہاہاما جزیرے کے گلوب آرک کا ذکر آیا تو تمام ایشیائی باشندے چونک گئے۔ امریکہ کی ایک خاتون کے نام کے علاوہ فلپائن کے ماہر نباتات ہاتورا اور پاکستان کے عالمی شہرت یافتہ نجومی خورشید بگرامی کا نام پڑھا جا رہا تھا۔

جیرالڈ موس کے سیکرٹری کے بیان میں سچائی تھی۔ اتنی سچائی تھی کہ اس کے بیان کے ایک حصے کو سنسر کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ بات چار بڑے ممالک کے خلاف تھی۔ لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ دُمدار ستارے کو عوام سے چھپاتے اور اپنا اپنا اہم افراد کی جانیں بچانے کے لیے وہ ممالک بھی گلوب آرک جیسے منصوبوں میں شریک تھے۔ سب یہودیوں نے اندر ہی اندر انہیں کاٹ کر اپنے لیے راستہ ہموار کر لیا۔ تو اب وہ دشمنوں کے محاسبے کے لیے منظرِ عام پر آگئے۔

۲۶ دسمبر کی صبح اخبارات نے خورشید بگرامی اور ہاتورا وغیرہ کے متعلق خبریں شائع کیں کہ وہ کس طرح اغوا کیے گئے۔ عوام کو ہدایت کی گئی کہ وہ ان کی واپسی کے لیے غیر قانونی مظاہرے نہ کریں۔ اگر جلد بازی کی گئی تو اغوا کیے جانے والوں کی جانیں خطرے میں پڑ جائیں گی کیونکہ وہ دشمنوں کے نرغے میں ہیں۔

یوں بھی لوگوں کو اب کسی قسم کا مظاہرہ کرنے کا ہوش نہ تھا۔ کیونکہ اب وہ دُمدار ستارہ دن کی روشنی میں سہ پہر کے بعد نظر آگیا تھا۔

وہ جسامت میں چاند سے بڑا تھا۔ جب وہ پوری طرح واضح ہوا تو زمین سرخ رنگ میں نہا گئی۔ اچانک ہی زلزلے کے جھٹکے محسوس ہوئے۔ در و دیوار لرزنے لگے۔ شیشے ٹوٹنے لگے۔ بکھرنے لگے۔ ایکدم سے بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ بدحواس ہو کر گر رہے تھے۔ وہ جیسے ایک لمحہ کی بات تھی۔ پھر زمین شانت ہو گئی۔

سرکاری طور پر اعلانات کیے جا رہے تھے۔ ہدایات دی جا رہی تھیں کہ لوگوں کو کس طرح ہوش و حواس میں رہ کر اپنے بچاؤ کی فکر کرنی چاہیے۔ دُمدار ستارے کے ذریعہ آگ پھیلنے اور عمارتوں کے گرنے کا خطرہ تھا۔ اے آر پی کے دفاتر سے ہدایات دی جا رہی تھیں کہ لوگ اپنے اپنے مکانوں اور کارخانوں کے قریب لمبے گڑھے کھود لیں۔ تاکہ آسمانی آفت کے حملوں سے بچنے کے لیے ان گڑھوں میں پناہ لے سکیں۔ ہر محلے میں طبی امداد کے مراکز قائم کر دیے گئے تھے۔ فائر بریگیڈ کے محکموں کو چوبیس گھنٹے مستعد رہنے کی سختی سے تاکید کی گئی تھی چونکہ آگ پھیلنے کا زیادہ خطرہ تھا۔ اس لیے بجلی گھر، کوئلے کے گودام اور تیل کی ٹنکیوں کی خاص طور سے حفاظت کرنے کے انتظامات کیے گئے تھے۔ لوگ اپنے گھروں کے اطراف اور چھتوں کے اطراف اور چھتوں پر ریت سے بھرے ہوئے تھیلے رکھ رہے تھے جو دولت مند تھے، وہ گیس ماسک حاصل کرنے کی فکر میں تھے۔

انسان کیا ہے یہ خود انسان اپنی تشریح نہیں کر سکتا۔ البتہ اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ اسے خدا سے ڈراؤ تو نہیں ڈرتا، موت سے ڈراؤ تو خوف سے کانپنے لگتا ہے۔ اور جب موت کا خطرہ ٹل جائے تو موت کو بھی بھول جاتا ہے۔ ۲۵ دسمبر سے پہلے عبادت گاہوں میں بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ ۲۵ دسمبر کو جب یہودی سازشیں بے نقاب ہوئیں تو خیال گزرا کہ دُمدار ستارہ محض فراڈ تھا۔ یہ یہودی ساری دنیا پر چھا جانے کے لیے ایک دُمدار ستارے کا اسکینڈل کھڑا کر رہے ہیں۔ خلا میں کوئی راکٹ چھوڑا گیا ہے اور اسے خطرناک ستارہ کہہ کر ڈرایا جا رہا ہے۔ لہٰذا عبادت گاہوں سے بھیڑ چھٹنے لگی۔

۲۶ دسمبر کی سہ پہر کے بعد پھر اچانک ہی مسجدیں، مندر اور گرجا گھر بھر گئے۔ لوگ مرتے مرتے بھی رشوت دینے سے باز نہیں آتے۔ وہ دل کھول کر اپنی اپنی عبادت گاہوں میں چندہ دینے لگے۔ خدا کو خوش کرنے کا یہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔

کیا ہونے والا ہے اور کیا نہیں ہونے والا ہے؟ لوگ اب تک تذبذب میں تھے۔ ان حالات میں یوں ہوا کہ انسان تین خانوں میں بٹ گئے۔ ایک خانے میں وہ لوگ تھے جو عبادات میں مصروف ہو گئے تھے۔ اور اپنے پچھلے گناہوں کو سجدوں کے دوران گناہ پاؤڈر سے دھو رہے تھے۔

دوسرے خانے میں وہ لوگ تھے جو اپنی موت کو اٹل سمجھ کر فیصلہ کر چکے تھے کہ ہنستے ہنستے مر جائیں گے۔ زندگی کی جتنی خوشیاں ہیں۔ وہ چوبیس گھنٹوں میں سمیٹ لیں گے۔ سرکاری احکامات جاری ہونے تھے کہ عام تفریح گاہیں کھلی رہیں گی۔ تمام تفریحی ٹیکس معاف کر دیے گئے تھے۔ رعائتی ٹکٹ پر سینما اور تھیٹر کھلے رہتے تھے۔ وہسکی، بیئر اور برانڈی وغیرہ کی قیمتیں کم ہو گئی تھیں حتیٰ کہ طوائفوں نے بھی اپنے ریٹ گرا دیے تھے۔

تیسرے خانے میں وہ لوگ تھے جو مارے دہشت کے نہ دین کے رہے تھے، نہ دنیا کے۔ وہ سکتے کے عالم میں تھے اور یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ اس لیے وہ ایک عجیب بے خودی کے عالم میں موت کا انتظار کر رہے تھے۔

رات کو ریڈیو کی خبروں نے بتایا کہ ترکی میں زلزلہ آیا ہے صرف وہ عمارتیں جو فولاد اور کنکریٹ سے بنائی گئی تھیں۔ وہ کسی حد تک محفوظ ہیں۔ باقی تمام عمارتیں زمین بوس ہو چکی ہیں۔ تین گھنٹے تک تھوڑے تھوڑے وقفہ سے زمین لرزتی رہی۔ اب وہاں موت کا سناٹا ہے۔ شہر کے بہت حصوں میں آگ پھیلی ہوئی ہے۔ اب تک اس بات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکا کہ کتنے انسان لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔

دُمدار ستارہ ابھی کشش ثقل میں نہیں آیا تھا لیکن زمین اس سے متاثر ہو رہی تھی۔ آدھی رات کے بعد خبر ملی کہ خلیج بنگال سے طوفان اٹھا ہے۔ جزائر انڈمان اور سندیپ جیسے جزیرے سمندر کی غضبناک لہروں میں گم ہو چکے ہیں۔ دہشت بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر ملک ہر شہر کے لوگ اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک ریلوے انجن کے ڈرائیور نے بتایا کہ ایک شخص جنونی انداز میں چیختا ہوا بھاگتی ہوئی ٹرین کے نیچے آگیا۔ کئی جگہ سے ایسی اموات کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ کمزور دلوں کے مرد عورتیں قیامت سے دہشت زدہ ہو کر خودکشی کر رہے تھے۔

ایک جوان عورت ہسٹریائی انداز میں قہقہے لگاتی ہوئی ایک خون آلود چھرا لیکر گھر سے باہر آگئی۔ پھر چیختی ہوئی کہنے لگی۔

"میں نے اپنے بھائی کو مار ڈالا۔ وہ سو رہا تھا۔ میں نے اسے مار ڈالا۔ ہاہاہاہا۔ میرا بوڑھا باپ جہیز کے لیے پیسے جوڑتے جوڑتے مر گیا۔ میرا بھائی محنت کرتے کرتے بوڑھا ہو گیا۔ سالا بوڑھا ہو گیا۔ اب میرے لیے کیا جہیز جوڑے گا۔ اس لیے میں نے ختم کر دیا۔ ہاہاہاہا۔ میں سالی کیسی کنواری ہوں۔ بال سفید ہو گئے۔ قیامت آگئی اور میں دلہن نہ بن سکی۔ دیکھو۔ دیکھو میں اپنا جوڑا سہاگ کے رنگ میں رنگ رہی ہوں۔ مجھے قیامت کے ڈولے میں لے جاؤ۔"

یہ کہتے ہی اس نے چھرے کو اپنے سینے میں گھونپ لیا۔ لوگ چیختے ہوئے ادھر اُدھر بھاگنے لگے کہ کہاں بھاگیں؟ کہاں جا کر مریں؟

ارے قیامت آگئی۔ اور ہمیں جینے کا تو کیا مرنے کا بھی سلیقہ نہ آیا۔

۲۷ دسمبر کی صبح آسمان کا رنگ زرد ہو گیا ہوا جیسے بند ہو گئی۔ درخت کے پتے تک نہیں ہل رہے تھے۔

گرمی اچانک بڑھ گئی تھی۔ ہر طرف عجیب سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ آسمان کبھی زرد ہوتا تھا، کبھی سرخ ہو جاتا تھا۔ زمین اس کے رنگ میں نہا جاتی تھی۔ اس کے بعد آسمان پھر رنگ بدل دیتا تھا۔ شاید یہ دکھانے کے لیے کہ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔

ہاہاما جزیرے میں قبرستان کی سی ویرانی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہاں تقریباً پینتالیس مرد اور پچیس عورتیں تھیں۔ مردوں میں پندرہ مسلح فوجی جوان تھے۔ باقی تیس اہم افراد تھے جو زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن اب وہاں کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ۲۴ اور ۲۵ دسمبر کی درمیانی شب یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان فساد کا آغاز ہوا تھا۔ صبح چھ یہودیوں اور تین عیسائیوں کی لاشیں دفن کی گئیں۔ ریکریشن ہال میں ٹوٹی ہوئی میز کرسیاں اور شیشے کے ٹکڑے جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔ ایک امن کمیٹی قائم کی گئی۔ لوگوں کو سمجھایا گیا کہ وہ لوگ پرانی دنیا کے رشتوں کو اور تہذیب کو چھوڑ کر ایک نئی دنیا بسانے کے لیے گلوب آرک میں جا رہے ہیں۔ لہٰذا کسی بھی مذہب کو زیر بحث لا کر آپس میں جھگڑا نہیں کرنا چاہیے۔

سب ہی نے تسلیم کیا کہ شراب کی مستی میں وہ لوگ مذہبی بن گئے تھے۔ حالانکہ نہیں بننا چاہیے تھا جب خون کے رشتوں کو توڑ کر چلے آتے تو پھر محبت نہ رہی۔ اور جہاں محبت نہ ہو۔ وہاں ایمان سلامت نہیں رہتا۔ لہٰذا آپس میں صلح ہو گئی لیکن سہ پہر کو ٹی وی کے خصوصی پروگرام میں جب یہودیوں کی سازشیں بے نقاب کی گئیں۔ تو اس جزیرے کے عیسائی اپنے دماغ میں خطرے کی گھنٹی سننے لگے۔ خورشید بگرامی اور ہاتورا اپنے کاٹیج میں ریڈیو کے ذریعہ یہ خبریں سن رہے تھے۔ خورشید بگرامی کے سامنے ایک بڑا سا کاغذ پھیلا ہوا تھا جس پر منبرے اور خطوط نظر آ رہے تھے۔ وہ دُمدار ستارے کی موجودہ چال کو سمجھ رہا تھا۔

ہاتورا کا دھیان دو طرف بٹا ہوا تھا۔ ریڈیو کی خبریں بھی اہم تھیں اور خورشید بگرامی کے سامنے بچھا ہوا کاغذ بھی اہم تھا۔ اس نے پوچھا۔

"مسٹر خورشید! آپ خبریں سن رہے ہیں؟"

"ہاں سن رہا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی سازشیں بے نقاب ہو گئیں۔ ہمارا نام دنیا والوں کے سامنے آگیا کہ ہمیں اغوا کیا گیا ہے۔ اب میں تمہیں خوشخبری سناتا ہوں کہ تم اپنی سومتا سے مل سکو گے۔"

ہاتورا خوشی سے اچھل کر اس کے قدموں کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"کہاں ہے وہ دمدار ستارہ ؟ پلیز آپ مجھے بتائیں۔"
خورشید بلگرامی کاغذ پر جھک کر پنسل کی نوک وہاں رکھتے ہوئے سمجھانے لگا۔
"سورج کے مدار پر ہماری یہ زمین گھوم رہی ہے۔ جب میں نے اگست کی پہلی تاریخ کو دمدار ستارے کی آمد کے بارے میں پیشگوئی کی تو اس وقت ہماری زمین یہ دیکھو اس خط سے گزر چکی تھی جسے عدول صیفی کہتے ہیں اور دمدار ستارہ خط عدول شتوی اور خط اعتدال ربیعی کے درمیان اپنا راستہ بنا رہا تھا۔
اب زمین کی گردش کو دیکھو۔ یہ موسم سرما میں ۲۲ دسمبر کو عدول شتوی سے گزرتی ہے اور جیسا کہ اب گزر کر اعتدال ربیعی کی طرف جا رہی ہے اور یہ دمدار ستارہ اپنی ڈگر پر رواں دواں ہے۔ ہمیں پورا پورا یقین تھا کہ یہ ستارہ اس سرخ خط پر اٹھائیس دسمبر کو زمین سے ٹکرا جائے گا۔۔۔۔"
"تو کیا نہیں ٹکرائے گا ؟" ہاتورا نے بیتابی سے پوچھا۔
"نہیں ٹکرائے گا۔ مگر زمین پر اثرانداز ہوگا۔ ہم اپنی زمین کی گردش کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن دمدار ستارے کی رفتار کے متعلق جو اندازہ لگایا تھا کہ وہ سات سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلا آ رہا ہے۔ تو یہ اندازہ ذرا غلط ہو گیا۔ اس کی رفتار اور زیادہ ہے اتنی زیادہ ہے کہ وہ خطرے کی اس سرخ لائن سے گزر چکا ہے جہاں ہماری زمین اٹھائیس دسمبر کو پہنچنے والی ہے۔
چونکہ یہ زمین کے بہت ہی قریب سے گزر رہا ہے۔ اس لیے اٹلی میں زلزلہ آیا ہے۔ کل ۲۶ دسمبر کو زمین کی گردش کے مطابق جاپان بحرالکاہل اور خلیج بنگال کے بہت سے حصے اس ستارے سے متاثر ہوں گے۔ پرسوں ۲۷ دسمبر کو رات کے گیارہ بجے بحر اوقیانوس جہاں کے ایک جزیرے میں ابھی ہم موجود ہیں۔ یہ تمام علاقے بہت کم متاثر ہوں گے کیونکہ اس وقت تک وہ ستارہ سورج کے مدار سے نکل چکا ہوگا اور ایک بار پھر ۱۶۶۴ء کی طرح جیو پیٹر (مشتری سیارہ) کی طرف سفر کرے گا۔"
"آپ نے ابھی کہا ہے کہ کل بحرالکاہل کا حصہ متاثر ہوگا۔ یہاں میرا ملک فلپائن ہے وہاں میری سومنا رہتی ہے۔"
"گھبراؤ نہیں۔ انشاء اللہ تمہاری سومنا محفوظ رہے گی۔"
"مگر ہم نہیں رہیں گے مسٹر خورشید! پرسوں یہ جزیرہ اس ستارے سے متاثر ہوگا۔"
"ہوں"۔ وہ قدرے پریشان ہو کر بولا۔ "ہمیں اپنے علم سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ مگر ہم اس ہونی کی صحیح تصویر نہیں دیکھ سکتے۔ کہ وہ حالات کیسے پیش آئیں گے ؟ اگر یہی معلوم ہو جاتا تو ہم تدبیر کے ذریعہ ہونی کو انہونی کر دیتے۔"
"مسٹر خورشید! اتنا تو معلوم ہے کہ پرسوں زمین کا یہ حصہ متاثر ہوگا۔ ہم اپنی جان بچانے کی کوشش تو کر سکتے ہیں۔ دیکھیے میں صاف کہہ دیتا ہوں کہ مجھے یہ گلوب آرک کی زندگی منظور نہیں ہے میں قیدی بن کر نہیں جاؤں گا۔ اگر آپ ہمت سے کام لیں تو ہم یہاں سے فرار ہو سکتے ہیں۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر یہاں کے عیسائیوں کو دوست بنا کر ان یہودیوں پر غالب آ سکتے ہیں"۔
وہ جواب دینے کے بجائے اپنی دائیں ہتھیلی کو دیکھنے لگا۔ ہاتورا نے پوچھا۔
"کیا آپ اپنے ہاتھ کی لکیریں دیکھ رہے ہیں ؟"
"ہاں دیکھنا نہیں چاہتا مگر دیکھ رہا ہوں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ کاتب تقدیر نے میرے لیے جو فیصلہ لکھ دیا ہے۔ اس فیصلے کو ہاتھ کی لکیروں سے پڑھے بغیر قبول کر لوں، مگر جب نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہوں۔ تو ہتھیلی نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے اور لکیریں خود بخود بولنے لگتی ہیں"۔
"کیا بولتی ہیں یہ لکیریں ؟ کیا یہ آپ کو ڈراتی ہیں کہ آپ میرا ساتھ نہ دیں ؟"
"تم لکیروں کی زبان نہ پوچھو۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا مگر اس شرط پر کہ میری ماجدہ میرے ساتھ جائے گی"۔
"مسٹر خورشید! جو عورت بیٹی کے رشتہ کو گالی سمجھتی ہے آپ اسے ماجدہ کہتے ہیں۔ وہ آپ کے ساتھ نہیں جائے گی"۔
"میں اسے یقین دلاؤں گا کہ قیامت ٹل گئی ہے"۔
"وہ اتنے سائنسدانوں اور ماہرین فلکیات کے درمیان رہ کر ایک نجومی کی باتوں کا یقین نہیں کرے گی"۔
"میں ہمت راؤ کو چیلنج کروں گا کہ وہ گلوب آرک کی آبزرویٹری سے دمدار ستارے کو دیکھے۔ انہیں میری باتوں کا یقین آ جائے گا۔ پھر وہ روپ وتی کو یقین دلائے گا"۔
"خدا کے لیے آپ کسی کو چیلنج نہ کریں۔ وہ لوگ آپس کے جھگڑوں میں الجھ کر آبزرویٹری کی طرف نہیں جا رہے ہیں۔ اگر ان یہودیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ دمدار ستارے کا خطرہ ٹل گیا ہے تو وہ اپنے جرائم کے ثبوت مٹانے کے لیے ہمیں مار ڈالیں گے۔ وہ نہیں چاہیں گے کہ ہم اپنے ملک واپس جا کر اپنے اغوا کیے جانے والے واقعات کی تصدیق کریں"۔
ہاتورا درست کہہ رہا تھا۔ خورشید بلگرامی نے سوچا۔
"اچھی بات ہے۔ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔ مگر روپ وتی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکوں گا"۔
"مسٹر خورشید! میں روپ وتی کی برائی نہیں کروں گا۔ آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ دنیا والوں نے اس کے اندر زہر بھر دیا ہے۔ وہ زہریلی ناگن بن گئی ہے۔ اگر آپ اسے اپنے ساتھ یہاں سے لے جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ تب بھی اس کی بدنامیاں اٹھا کر زندہ نہیں رہ سکیں گے"۔
"اس کے ساتھ مر تو سکوں گا ؟"
خورشید بلگرامی کا عزم دیکھ کر وہ جھنجھلا گیا۔ کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولا۔
"آپ میرا ساتھ دیں یا نہ دیں میں تنہا اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا"۔
"رک جاؤ ہاتورا۔ جلد بازی نہ کرو۔۔۔۔"
مگر اب وہ رکنا نہیں چاہتا تھا تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ پھر کاٹیج سے باہر آیا۔ وہاں مسلح فوجیوں کا افسر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔
"سوری مسٹر ہاتورا۔ آپ لوگ کاٹیج سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اس بار آپ ہی کو نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی ان کے اپنے کاٹجوں سے باہر نکلنے کے لیے منع کیا گیا ہے۔ یوں سمجھیے کہ کرفیو آرڈر ہے۔ باہر نکلنے والے کو گولی مار دی جائے گی"۔
ہاتورا نے بے بسی سے دیکھا۔ کاٹیج کے احاطہ کے گیٹ پر دو مسلح جوان مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ جیسے حکم ملتے ہی گولی چلا دیں گے۔ وہ سر جھکا کر کاٹیج میں واپس آ گیا۔
کاٹیج نمبر دس میں روپ وتی ایک ایزی چیئر پر بیٹھی ہمت راؤ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اور بڑبڑا رہا تھا۔
"یہ لوگ شروع سے مجھ پر بھروسہ کرتے آ رہے تھے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے اپنے کاٹیج میں کیوں قید کر دیا گیا ہے ؟"
روپ وتی نے کہا۔ "صرف تمہیں نہیں، سب ہی کو قید کیا گیا ہے۔ تم نے سنا نہیں، وہ آفیسر کہہ رہا تھا کرفیو آرڈر ہے۔ صرف کاٹیج کی عورتیں کھانا، شراب اور سگریٹ وغیرہ لانے کے لیے ریکریشن ہال تک جا سکیں گی۔ یعنی تم قیدی ہو اور میں آزاد ہوں"۔
"بکواس مت کرو"۔ وہ جھنجھلا کر بولا۔ "میں تمہیں یہاں لا کر پچھتا رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں نو آدمی مارے جا چکے ہیں ان کے ساتھ آنے والی نو حسین عورتیں اب فاضل ہیں۔ میں تمہیں چھوڑ کر ان میں سے کسی ایک کو اپنے ساتھ گلوب آرک میں لے جاؤں گا"۔
وہ حقارت سے بولی۔ "اتنی سمجھ مجھ میں بھی ہے کہ جو آدمی بڑھاپے میں اپنے بیٹے کو دھوکہ دے کر چھوڑ سکتا ہے۔ وہ مجھ سے بھی دغا کر سکتا ہے"۔
"وہ میرا بیٹا نہیں ہے"۔ ہمت راؤ نے غصہ سے چیخ کر کہا۔
"تمہارا بیٹا ہے یا اس کا بیٹا ہے یا اس کا بیٹا ہے۔ یہ بات صرف عورتیں ہی دعوے سے کہہ سکتی ہیں۔ مردوں کو صرف شوہر اور باپ کا لیبل لگا کر خوش رہنا چاہیے۔ ہا ہا ہا ہا۔۔۔۔"
وہ قہقہہ لگاتی ہوئی کرسی سے اٹھ کر بولی۔
"میں کھانا لانے جا رہی ہوں۔ ویسے ان نو عورتوں سے پوچھ لوں کہ کون تمہیں گھاس ڈالے گی"۔
وہ ہنستی ہوئی کاٹیج کے باہر آئی۔ باہر ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ایک مسلح سپاہی کھڑا ہوا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کے پاس سے گزر گئی۔ سو گز کے فاصلے پر ریکریشن ہال تھا۔ ریکریشن ہال کے قریب جب وہ پہنچی تو اسے دور ایک نمبر کاٹیج نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی خورشید بلگرامی کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آیا۔ اس کا سر آپ ہی آپ جھک گیا۔ وہ سوچنے لگی۔
"یہ میرا سر کیوں جھک گیا۔ سر تو بھگوان کی مورتی کے سامنے یا کسی مقدس رشتہ کے سامنے جھکتا ہے۔ جبکہ بھگوان نے کبھی میرا ساتھ نہیں دیا۔ اور مقدس رشتوں نے کبھی اپنی پہچان نہیں کرائی۔ مگر اس سنہری داڑھی والے کا خیال آتا ہے تو پتہ نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ میں نے گڑیا کو سینے سے لگایا تھا۔ اس سے میرا دل بھی چاہتا تھا کہ گڑیا بن کر اس نجومی کے سینے سے لگ جاؤں۔ اس کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ میری زندگی کے شرمناک موڑ سے اس کی بیٹی بھی گزر چکی ہے۔ م۔ مگر۔ مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔۔۔۔۔"
اس نے پھر ایک نمبر کاٹیج کو دیکھا تو یوں لگا جیسے وہ کاٹیج کے اندر رو رہا ہے۔ ایک بیٹی اسے رلا رہی تھی۔ اس بیٹی کا کوئی بھی نام ہو سکتا ہے۔ تب روپ وتی کو پتہ چلا کہ وہ پچھلی رات سے اسی لیے اندر ہی اندر موم ہو رہی تھی کہ ابھی اس دنیا کے باپ اپنی بیٹیوں کے لیے آنسو بہانا جانتے ہیں۔ اگر اس کی اپنی تقدیر پھوٹ گئی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بزرگوں کا احترام کرنا ہی چھوڑ دے اور تب اس نے اپنے جھکے ہوئے سر کو سمجھ لیا کہ وہ احتراماً جھکتا ہے۔
اس نے ریکریشن ہال میں آ کر ایک بوتل وہسکی اور دو آدمیوں کا کھانا پیک کرنے کا آرڈر دیا۔ پھر ایک میز کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ گرما گرم کھانا پیک ہو کر آنے میں ذرا دیر لگتی ہے۔ لیکن وہسکی کی بوتل اور شیشے کا جام فوراً ہی اس کے سامنے میز پر رکھ دیے گئے۔
یہ تو پینے والے ہی سمجھتے ہیں کہ بوتل دیکھتے ہی کس طرح پیاس بڑھ جاتی ہے۔ دماغ کے آسمان پر گھٹائیں چھانے لگتی ہیں روپ وتی کی آنکھوں میں خمار چھانے لگا۔ وہ بوتل کھول کر ایک پیگ بنانے لگی۔ سمندر کو چھو کر آنے والی سرد ہواؤں میں وہسکی کا مزہ آتا ہے۔ وہ نشیلی آنکھوں سے جام کو دیکھنے لگی۔ اچانک جام کے شفاف شیشے میں خورشید بلگرامی نظر آیا۔ وہ ہمت راؤ کے ہاتھ پر ٹھوکر مار کر اس کا ریوالور گرا رہا تھا۔ پھر اسے زمین پر پٹخ کر اسے گھونسے مارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"شیطان کے بچو! آج اگر میری بیٹی زندہ ہوتی تو تم لوگ اسے بھی حوا آف کہہ کر ذلیل اور رسوا کرتے رہتے ...... میں تمہیں مار ڈالوں گا ہمت راؤ۔ میں تمہیں مار ڈالوں گا ملک مختار ......"

روپ وتی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ خورشید بلگرامی اس کی زندگی میں آنے والا پہلا انسان تھا، جو اس کی خاطر ہمت راؤ اور ملک مختار جیسے تمام لوگوں کو مار ڈالنا چاہتا تھا۔ ایک غیرتمند باپ کی طرح اس کے سر پر آنچل رکھنا چاہتا تھا۔

شیشے کے جام میں نظر آیا۔ خورشید بلگرامی اس کے سر پر آنچل رکھ کر کہہ رہا تھا۔

"بیٹی ماجدہ! یہ بری بات ہے۔ شریف زادیاں شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاتیں۔ اسے نہ پیو۔"

"پتاجی! میں نہیں پیوں گی۔ ضرور نہ پیوں گی۔"

تڑاخ سے اس کے منہ پر طمانچہ پڑا۔ مارے خوشی کے وہ ہنسنے لگی۔ پہلی بار ایک باپ نے برائی سے باز رکھنے کے لیے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ پہلی بار ایک باپ کی بیٹی بننے کا مزہ آیا تھا مگر شیشے کے جام سے وہ منظر جلد ہی ختم ہو گیا۔ اب اس کے آس پاس وہی ریکریشن ہال کا منظر تھا اور سامنے کھڑا ہوا فوجی افسر پوچھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے۔ تم کیوں رو رہی ہو؟"

اس نے چونک کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا تو بڑا تعجب ہوا کہ وہ رو رہی تھی۔ افسر نے پوچھا۔

"کیا ہمت راؤ سے جھگڑا ہو گیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ......"

وہ میز پر جھک گیا۔ پھر آہستگی سے بولا۔ "میرے پاس آ جاؤ۔ تم بیحد حسین ہو۔"

وہ اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ روپ وتی اس کے چہرے کو دیکھتی ہوئی چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

"آفیسر! میں خوفزدہ ہوں۔"

"کس سے؟" اس نے پوچھا۔ "مجھے بتاؤ۔ میں اسے گولی مار دوں گا۔"

"ایک فرشتہ، جو کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا، تم اسے گولی کیوں مارو گے؟"

"کیا تم کسی فرشتے سے خوفزدہ ہو؟"

"ہاں آفیسر تم خود سوچو! اگر وہ فرشتہ سامنے آتا رہے گا تو میں گناہگار نہیں بن سکوں گی۔ پھر میں ہمت راؤ کے پاس، تمہارے پاس یا کسی بھی کمینے کے پاس نہیں جا سکوں گی۔"

آفیسر نے چونک کر کہا۔ "اسے تم گالی دے رہی ہو۔"

"مجبوراً کیوں مانتے ہو؟ یہاں ہم سب کے درمیان گالیوں کا ہی رشتہ ہے۔ اگر نہیں ہے تو مجھے بیٹی بنا کر پاس بلاؤ۔"

آفیسر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہمارے درمیان گالیوں کا ہی رشتہ بہتر رہے گا۔ چلو میرے ساتھ ......"

"اوں ہونہہ۔ میں نے کہا تھا نا، جب تک وہ فرشتہ رہے گا۔ میں اندر سے کمزور ہوتی جاؤں گی۔ کیا تم خورشید بلگرامی کو اس جزیرے سے بھگا سکتے ہو؟"

"اچھا تو تم اس فرشتے سے ڈرتی ہو۔ اب مجھے یاد آیا ابھی تھوڑی دیر پہلے میں ایک نمبر کالج میں یہ حکم سنانے گیا تھا کہ وہ کالج سے باہر قدم نہ نکالیں۔ لیکن انہیں کچھ کہنے سے پہلے میں نے کالج کی ایک کھڑکی کے قریب چھپ کر ان کی باتیں سنیں۔ جانتی ہو خورشید بلگرامی نے کیا پیشگوئی کی ہے؟ وہ ہاتورا سے کہہ رہا تھا کہ مدار ستارہ ہماری زمین سے نہیں ٹکرائے گا۔"

"کیا صرف ایک آدمی کے ایسا کہہ دینے سے وہ ستارہ ناکام ہو کر واپس چلا جائے گا؟"

"اسی ایک آدمی نے تو سب سے پہلے قیامت کا ذکر چھیڑا تھا۔ سب سے پہلے اسی نے پیشین گوئی کی تھی۔ کہ مدار ستارہ آ رہا ہے۔ بعد میں دوسرے ماہرین نے تصدیق کی۔ اب اس کی تازہ ترین پیشگوئی ہے کہ وہ ستارہ زمین سے نہیں ٹکرائے گا۔ اس نے یہ بات چھپا رکھی ہے۔ لیکن میں ابھی تمہارے کالج گیا تھا۔ میں نے ہمت راؤ اور دوسرے ماہرین فلکیات کو گلوب آرک میں بھیجا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ واپسی پر پھر ایک بار خورشید بلگرامی کی پیشین گوئی کی تصدیق کریں گے۔"

روپ وتی نے خوش ہو کر پوچھا۔ "اوہ۔ تو پھر قیامت کے ٹل جانے کی امید پیدا ہو گئی ہے۔"

"ہاں میں یہی کہہ رہا تھا۔ جیسے ہی ہمت راؤ گلوب آرک سے واپس آ کر یقین دلائے گا کہ مدار ستارے کا خطرہ ٹل گیا ہے ویسے ہی پہلی فرصت میں خورشید بلگرامی اور ہاتورا کو شوٹ کر دیا جائے گا۔"

روپ وتی کا مسکراتا ہوا چہرہ اچانک ہی مرجھا گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ہم نہیں چاہتے کہ وہ دونوں اپنے اپنے ملک واپس جا کر اپنے اغوا کیے جانے کی داستان سنائیں۔ میری جان تمہاری طرح ہم بھی اس فرشتے سے خوفزدہ ہیں۔ تم اسے صرف جزیرے سے بھگانا چاہتی ہو۔ ہم اسے دنیا سے بھگا دیں گے۔"

وہ سن رہی تھی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر سرد لہجے میں بولی۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

آفیسر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"میں تو خورشید بلگرامی کا قصہ ہی تمام کر دوں گا۔ باتی دی تم اسے یہاں سے بھگانا کیوں چاہتی ہو؟"

"میں اس کا سامنا نہیں کر سکتی۔"

وہ دونوں ریکریشن ہال سے نکل کر ایک کالج کی طرف جا رہے تھے۔ آفیسر نے کہا۔

"جب میں کھڑکی کے پاس چھپ کر باتیں سن رہا تھا اس وقت ہاتورا اس نجومی کو سمجھا رہا تھا کہ وہ تمہیں بیٹی نہ سمجھے اس جزیرے سے فرار ہونے کی کوشش کرے۔ مگر وہ نجومی تمہیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا ہے۔"

روپ وتی نے چلتے چلتے ایک سرد آہ بھری۔ اس کا یہ پہلا تجربہ تھا کہ پیار کے پاکیزہ جذبوں سے بھی آہیں نکلتی ہیں۔

"کیا خورشید بلگرامی کی تمہاری جیسی کوئی بیٹی تھی۔ یا اب بھی ہے؟"

وہ بہت دور جیسے کسی اندھے کنویں سے بولی۔

"اس نجومی جیسے کتنے ہی باپ ہیں جن کے گھروں میں میری جیسی بیٹیاں ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ میں اس کی ماجدہ نہیں ہوں۔ مگر مجھے ماجدہ کہتا ہے۔"

"تمہیں اس کی حماقت پر ہنسی آتی ہو گی؟"

"نہیں، اپنی حماقت پر ہنسی آتی ہے۔ پھر مجھے یوں لگتا ہے کہ میں ماجدہ ہوں۔ میرا سینہ جو اندر سے خالی اور کھوکھلا ہو چکا ہے وہاں بیٹی بیٹی کی آواز گونجتی ہے۔ تب میں بکھر جاتی ہوں۔ اس ناپاک وجود کے اندر ایک باپ پکارتا ہے تو میں بکھر جاتی ہوں کہ کیسے اس کے سامنے جاؤں گی؟ میں مر نہ جاؤں گی؟"

"مریں تمہارے دشمن۔" آفیسر نے کالج کے سامنے رک کر اسے چومنا چاہا۔ روپ وتی نے منہ پھیر کر کہا۔ "پہلے کالج میں چلو۔"

کالج کے صرف ایک کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ باقی کمرے تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ آفیسر نے آس پاس دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ گارڈ کہاں چلا گیا؟"

وہ اس مسلح سپاہی کو آواز دینے لگا۔ لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ گالیاں بکتا ہوا روپ وتی کا ہاتھ پکڑ کر دروازے تک آیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ کسی طرح کا خطرہ نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ تمام لوگوں کو ان کے اپنے اپنے کالج میں قید کر دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود آفیسر نے ریوالور ہاتھ میں لے کر کمرے کی تاریکی میں للکارا مگر تاریکی چپ رہی۔ اس نے دروازے کے ایک پٹ کو زور کی لات ماری۔ اس کا ردعمل یہی ہوا کہ وہ پٹ جھٹکے سے کھلا، واپس آ کر بند ہوا۔ اس کے بعد پھر کھل گیا۔

اسے اطمینان ہو گیا کہ کوئی نہیں ہے۔ اس نے کمرے میں آ کر سوئچ آن کیا۔ روشنی ہو گئی۔ کمرہ خالی تھا۔ وہ اطمینان سے روپ وتی کے ساتھ چلتا ہوا بیڈروم کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازے تک پہنچتے پہنچتے روپ وتی اچانک ہی اس کے ہولسٹر پر جھپٹ پڑی۔ ریوالور اس کے ہاتھ آ گیا تھا مگر اس کی کلائی آفیسر کی گرفت میں آ گئی تھی۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"روپ وتی! کیا تم مجھے احمق سمجھتی ہو؟ جس وقت میں نے یہ کہا کہ خورشید بلگرامی کو گولی ماری جائے گی تو اسی وقت تمہارا مسکراتا ہوا چہرہ بجھ گیا تھا۔ کیا میں اتنا نہیں سمجھ سکتا کہ جس فرشتے کو تم یہاں سے زندہ سلامت بھگانا چاہتی ہو، اس کی موت کا فیصلہ پسند نہیں کرو گی۔ اس فیصلے پر عمل ہونے سے پہلے ہی تم مجھے مار ڈالنا چاہتی تھیں۔ آؤ میری جان! میں تو تمہیں بڑے پیار سے ماروں گا۔"

اس نے روپ وتی کے ہاتھ کو ایک جھٹکا دے کر اسے بیڈروم کے اندر پھینک دیا۔ وہ تاریک کمرے کے فرش پر جا کر گری۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔

"آج میں ایشیا کے ایک حسن کو خلیج کر دیکھوں گا۔ سنا ہے وہاں کی خوبصورتی بڑی نمکین ہوتی ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا ......"

اس نے سوئچ کو آن کیا۔ بیڈروم میں روشنی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی قہقہہ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گیا۔ سوئچ بورڈ کے پاس ایک حسینہ ریوالور لیے کھڑی تھی۔ پیچھے سے کسی نے اس کے ہولسٹر سے ریوالور کھینچ لیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں دوسری حسینہ مسکرا رہی تھی۔ تیسری حسینہ کمرے کے دور افتادہ حصے میں ایک کرسی پر اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کی ایک ٹانگ کرسی کے ہتھے پر تھی۔ اس کے ہاتھوں میں اسٹین گن تھی۔

جہاں روپ وتی جا کر گری تھی۔ وہاں اس کے پیچھے ایک سنگار میز کے آئینے کے سامنے چوتھی نیگرو حسینہ ایک انڈروئیر اور بریزر پہنے کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ صحت مند جسم پر تیل چمک رہا تھا۔ وہ آئینے میں خود کو دیکھتی ہوئی اپنے ہونٹوں پر بائیں ہاتھ سے لپ اسٹک کی سرخی لگا رہی تھی۔ دائیں ہاتھ میں ریوالور کا رخ آئینے کی طرف تھا اور آئینے کے ریوالور کا رخ آفیسر کو دھمکی دے رہا تھا۔

روپ وتی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کرسی پر بیٹھی ہوئی حسینہ نے آفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کرسٹوفر! تم بھی یہودی ہو۔ میں بھی یہودی ہوں۔ مگر آج تمہارے خلاف ہتھیار اٹھا رہی ہوں۔ تم لوگوں کی ایک سازش ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ دنیا والوں پر ظاہر ہو چکی ہے۔ دوسری سازش کا ہمیں پتہ چلا ہے کہ ریکریشن ہال میں جھگڑے کے دوران جو تیرا اہم افراد مارے گئے ہیں۔ ان کی نو عورتیں اب تمہارے حساب سے بیکار ہو گئی ہیں۔ تم لوگ گلوب آرک میں خواہ مخواہ ہم عورتوں کی بھیڑ نہیں لگانا چاہتے۔

اس لیے کل صبح اُن بیچاریوں کو گولی ماردی جائے گی۔ سنا ہے کہ ان میں سے دو عورتوں کو جو بہت زیادہ حسین ہوں گی۔ انہیں ایکسٹرا کے طور پر یا فاضل پرزوں کے طور پر رکھ لیا جائے گا۔"

کرسٹوفر نے پریشان ہوکر چاروں طرف حسیناؤں کو دیکھا پھر وہ کرسی پر بیٹھی ہوئی حسینہ سے گھگھیا کر بولا۔

"ارسلا! تم عورتوں کو کسی نے بہکایا ہے۔ تم سب اتنی حسین ہو کہ ہم ایسے حسن کو فنا ہی نہیں کرسکتے۔"

بند دروازے کے پاس کھڑی ہوئی حسینہ نے کہا۔

"پہلے ہم یہی سمجھ کر مغرور ہوگئی تھیں کہ ہم جیسی حسیناؤں پر تم لوگ مر سکتے ہو مگر ہمیں مار نہیں سکتے۔ اب یہ سمجھ کر عقل آ گئی ہے کہ ہم سے زیادہ حسین عورتیں تمہاری وہ نہیں تھیں۔ جو تمہیں دودھ کے رشتے سے پکارتی تھیں۔ وہ بیٹیاں خوبصورت تھیں جو تمہارے لہو کے رشتوں پر فخر کرتی تھیں۔ وہ وفادار بیویاں تھیں جنہوں نے تمہارے لیے خوبصورت اور معصوم بچے پیدا کیے۔ تمہاری آئندہ نسل کو تمہارا نام دیا۔ حسن ان تمام عورتوں میں تھا جنہیں تم پرانی دنیا میں فنا ہونے کے لیے چھوڑ آتے۔ ہمارا حسن تو ہماری جوانی کے ساتھ ڈھل جائے گا۔ تمہاری نسل تک نہیں جائے گا۔ لہٰذا تم ابدی حسن کو فنا کرکے کمینگی دکھا سکتے ہو۔ تو ہمیں کب بخشو گے؟ نہیں کرسٹوفر! ہم تمہیں نہیں بخشیں گے۔"

سوئچ بورڈ کے پاس کھڑی ہوئی حسینہ نے کہا۔

"ان نو فاضل عورتوں میں سے چار عورتیں ہم ہیں۔ باقی پانچ عورتوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ وہ اب تک اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ انہیں ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ ہمیں ان کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ ہماری اس بغاوت کا راز فاش کردیں گی۔"

کرسی پر بیٹھی ہوئی ارسلا نے کہا۔

"ہماری کوشش یہی ہے کہ صبح ہونے تک ہم خاموشی سے تمام دشمنوں کو ابدی نیند سلا دیں گے۔ تمہارے اس کالج کے پہریدار کو بھی ہم نے یہاں اسٹور روم میں سلا دیا ہے۔"

پھر ارسلا نے نیگرو حسینہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"راشا! ذرا کرسٹوفر کو بتاؤ کہ ہم نے کس طرح گولی چلائے بغیر چھ قتل کیے ہیں۔"

زندگی کے بجھنے سے پہلے کرسٹوفر کا چہرہ بجھ گیا۔ سیاہ فام راشا آئینہ کے پاس سے پلٹ کر مسکرانے لگی۔ سیاہ چہرے پر سرخ ہونٹ انگارے کی طرح دہک رہے تھے۔ وہ آگے بڑھتی ہوئی بولی۔

"موت چیختی چنگھاڑتی ہوئی بھی آتی ہے اور اس طرح بھی آتی ہے کہ اس کی آہٹ بھی سنائی نہیں دیتی۔"

وہ رک گئی۔ اس نے اپنا ریوالور روپ وتی کو دیدیا۔ پھر کرسٹوفر سے کہا۔

"میں اپنے حسین محبوب کے ساتھ یہاں آئی۔ وہ دراصل میرا شوہر تھا۔ جیسا کہ تم جانتے ہو، وہ زہریلی جڑی بوٹیوں کا ماہر تھا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ عورت مرد کی جڑوں میں میٹھی ہوتی ہے۔ اگر کوئی تمہیں پیار سے بٹھائے رکھے تو اس کی قدر کرو۔ اور کوئی تمہیں جڑ سے اکھاڑنا چاہے تو اس کے لیے زہر بن جاؤ۔ ہی ہی ہی ہی۔۔۔۔"

اس نے ہنستے ہوئے تیل سے چمکتے ہوئے دونوں سیاہ بازوؤں کو پھیلا کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"میری آغوش میں آؤ۔ اور مجھے گلے لگا کر دیکھو کہ موت کیسی ہوتی ہے۔۔۔۔۔"

کرسٹوفر نے فوراً ہی سوچ لیا کہ ایسے بھی مرنا ہے ویسے بھی مرنا ہے پھر کیوں نہ وہاں سے بچ نکلنے کی جدوجہد کرے۔ راشا نے قریب آکر اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ کرسٹوفر کا ارادہ تھا کہ راشا کو اٹھا کر اس حسینہ پر اچھال دے، جو سوئچ بورڈ کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ وہ سب ایک لمحہ کے لیے بوکھلا جائیں گی۔ اس طرح اسے سوئچ آف کرنے کا موقع مل جائے گا۔ پھر اندھیرے میں ان سے نمٹنے میں آسانی رہے گی۔

اس ارادے کے تحت اس نے راشا کی کمر کو مضبوطی سے پکڑنا چاہا مگر تیل کی چکناہٹ پر ہاتھ پھسل گیا۔ دوسری بار اسے گرفت میں لینے کی مہلت نہ ملی۔ راشا کی لپ اسٹک کا پچھلا حصہ اس کی گردن سے لگا تھا۔ ایک سوئی سی چبھی۔ پھر اس کا دماغ سن ہوگیا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ راشا پیچھے ہٹ کر لپ اسٹک کے پچھلے حصے کو بند کرنے لگی۔ وہ آگے پیچھے ڈگمگا رہا تھا۔ پھر وہ سہارا لینے کے لیے آگے بڑھا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ وہ اس کی زندگی کی آخری گراوٹ تھی۔ اس کے بعد وہ اٹھ نہ سکا۔

موت اس طرح بھی آتی ہے کہ دوسروں کو آہٹ تک سنائی نہیں دیتی۔ کمرے میں چند لمحوں تک گہری خاموشی چھائی رہی۔ پھر ارسلا نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا۔ اب ہمیں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ ہم عورتیں کس حد تک جدوجہد کرسکتی ہیں۔ ہم ریوالور اور اسٹین گن کے ٹریگر کو انگلیوں سے دبا تو سکتی ہیں مگر صحیح نشانے پر گولیاں نہیں چلا سکتیں۔ صرف ایک راشا کب تک اپنی زہریلی اداؤں سے دشمنوں کو مارتی رہے گی؟"

راشا نے لپ اسٹک کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"اس میں زہر کے چند قطرے رہ گئے ہیں۔ اس سے اب شاید دو دشمنوں کو ہلاک کیا جاسکے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔"

ایک حسینہ نے کہا۔ "ہمیں یہاں کے چند مردوں سے دوستی کرنی ہوگی۔ وہ لوگ یہ ہتھیار استعمال کرسکیں گے۔"

ارسلا نے آگے بڑھتے ہوئے حقارت سے کہا۔

"جو لوگ اپنی ماؤں، بیٹیوں، بہنوں اور بیویوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر یہاں آئے ہیں۔ ہم ان پر اعتماد کیسے کرسکتی ہیں؟"

روپ وتی نے جلدی سے کہا۔

"یہاں ایک نمبر کالج میں ہاتورا اور خورشید بلگرامی دو ایسے آدمی ہیں، جنہوں نے دنیا کے رشتوں کو ٹھیس نہیں پہنچایا۔ یہ تم سب جانتی ہو کہ انہیں زبردستی یہاں لایا گیا ہے۔ وہی دونوں ہمارا ساتھ دے سکتے ہیں۔"

تمام عورتیں اس کی تائید کرنے لگیں۔ ارسلا نے سر ہلا کر کہا۔

"ہاں میں ان دو آدمیوں کو بھول گئی تھی۔ واقعی وہ ہمارا ساتھ دے سکتے ہیں۔ روپ وتی وہ نجومی تمہاری طرف کا آدمی ہے۔ تم اپنی زبان میں اسے اچھی طرح سمجھا سکتی ہو۔ اس لیے تم ایک نمبر کالج میں ہماری نمائندگی کرو گی۔"

"آں؟" روپ وتی نے پریشان ہوکر کہا۔ "نن نہیں۔ میں اس نجومی کے سامنے نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں نہیں جاؤ گی؟ کیا تم بھی ہمارا ساتھ دینے سے انکار کررہی ہو؟"

"نہیں، مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں تم لوگوں کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی جان بھی دے سکتی ہوں مگر اس کے سامنے نہیں جاسکتی۔ اگر جاؤں گی تو مر جاؤں گی۔ وہ مجھے بے۔۔ بیٹی کہتا ہے۔ اگر تم میں سے کسی کو کسی غیر مرد نے داشتہ کی بجائے بیٹی کہا ہے۔ یا بیٹی کہہ دے تو کیا تمہارا مر جانے کو جی نہیں چاہے گا؟"

وہ سب ہوس کی سیج پر سے گزرتے گزرتے تھک گئی تھیں۔ اس لیے روپ وتی کی باتوں کی گہرائی تک پہنچ گئیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"میں نہیں جانتی تھی کہ باپ اور بھائی کا رشتہ کیا ہوتا ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو میں نے دیکھا کہ میری جوانی کا سب سے پہلا دلال میرا شرابی باپ تھا۔ تب سے مجھے باپ کے رشتے سے نفرت ہوگئی۔ کسی بوڑھے کو اور ادھیڑ عمر کے آدمی کو دیکھتی ہوں تو جی چاہتا ہے اس کی بوٹیاں نوچ لوں۔

مگر پتہ نہیں اب مجھے کیا ہوگیا ہے۔ وہ۔ وہ نجومی کوئی جادوگر ہے۔ میری برسوں کی نفرت کو دھو رہا ہے۔ میرے اندر بیٹھ کر مجھے سمجھا رہا ہے کہ میں سستی عورت نہیں ہوں۔ بیٹی کے رشتے میں اتنی مہنگی ہوں کہ کوئی مجھے میلی آنکھ سے دیکھے گا تو میرا باپ اس کی آنکھیں نکال لے گا۔

ہائے! بیٹی کی آبرو کا یہ پہریدار باپ اب تک کہاں تھا؟

اس نے آنے میں اتنی دیر کیوں کر دی۔ اب در بر ہو ... ا ہے تو اُسے واپس چلے جانا چاہیے۔ کوئی اسے جا کر بتا دے ... رے اندر عورت کی وہ شرم جاگ گئی ہے، جو مقدس رشتوں سے ... ھ نہیں ملا سکتی۔ میں مر جاؤں گی یا پھر اس رشتے سے منہ چھپاتی ... رں گی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ " ... نہیں جاؤں گی۔ میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گی۔"

کمرے کی خاموشی میں اس کی آہیں اور سسکیا ... نڈلانے لگیں۔ اس کی بے حیا آنکھوں سے حیا کے سچے آنسو بہ ... ہے بھتے جہاں سچائی ہوتی ہے۔ وہاں انسان کو جھکنا پڑتا ہے۔ اس لیے تمام عورتوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔

●

گلوب آرک میں ہمت راؤ کے ساتھ چار ماہرینِ ... یات، دو انجینئر اور تین مسلح سپاہی گئے تھے۔ تاکہ خورشید بلگرامی کی ... ش گوئی کی سچائی کو آبزرویٹری کی مشینوں سے پرکھا جاتے۔ ایک گ ... کے اندر تصدیق ہوگئی کہ دمدار ستارہ مل گیا ہے۔ اب وہ اس موضوع ... ث کرنا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے ہی دو آدمی آبزرویٹری کا دروازہ ... ل کر اندر آگئے۔ اُن میں سے ایک انجینئر تھا۔ دوسرا سپاہی تھا۔ دونوں کے ... ہاتھوں میں سائیلنسر لگے ہوئے ریوالور تھے۔ انجینئر نے کہا۔

"ہمارے ساتھ جو ایک یہودی انجینئر اور دو ... ی یہاں آئے تھے۔ ہم نے بڑی خاموشی سے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ اب تمہاری باری ہے۔"

بات پوری ہوتے ہی دونوں کے ریوالور دو ... سے موت کی سرگوشیاں ابھریں۔ دو ماہرینِ فلکیات فرش پر ڈھیر ... گئے۔ ہمت راؤ تھر تھر کانپنے لگا۔ سپاہی نے کہا۔

"تم کیوں ڈر رہے ہو۔ تم یہودی نہیں ہو۔ ہماری جنگ اُن سے ہے۔ چلو مردہ سپاہیوں کے ہتھیار اٹھاؤ اور مو ... رچہ سنبھالو۔ ہم نے گلوب آرک کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ یہاں ہم ... آدمی ہیں۔ اور ہمیں اپنی زندگی کے لیے ان دشمنوں سے لڑنا ... "

انجینئر نے کہا۔ "ہم نچلی منزل میں رہیں گے۔ ہم ... ں سے بارہ آدمی پورٹ ہول کے پاس پانچ گھنٹے کی ڈیوٹی پر مستعد ر ... گا۔ خطرہ پیش آتے ہی الارم کا سوئچ آن کر دے گا۔ پھر ہم متحد ہوکر ... سے نمٹ لیں گے۔"

وہ آبزرویٹری سے باہر آئے۔ ہمت راؤ نے ک ...

"جزیرے میں یہودی سپاہیوں کی تعداد زیاد ... ہے۔"

سپاہی نے کہا۔ "ہمارے پاس بھی یہاں گ ... ب آرک میں گولے بارود کی کمی نہیں ہے۔"

انہوں نے مردہ سپاہیوں کے ہتھیار اٹھا لیے ... انجینئر نے کہا۔

"ہمت راؤ! ہمت ہارنے سے کام نہیں چلے گا۔ ہم اس وقت تک لڑتے رہیں گے۔ جب تک ہماری حکومتوں کی طرف سے امداد نہیں پہنچے گی۔"

وہ سب لفٹ کے ذریعہ نچلی منزل کی طرف جلنے لگے۔

جزیرے کی وہ رات بڑی پُراسراری تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک اونچے سے ٹیلے پر مشین گن رکھی ہوئی تھی۔ سپاہیوں نے وہاں مورچہ اس لیے بنایا تھا کہ وہاں سے تمام کاٹیج نظر آتے تھے آدھی رات کے بعد ایک سپاہی اپنے آفیسر سے ملنے گیا تو پتہ چلا کہ بڑی خاموشی سے یہودی قتل کیے جا رہے ہیں۔ تفتیش کے دوران ڈاکٹر نے بتلایا کہ پانچ عورتیں، ایک سپاہی اور ان کا آفیسر کرسٹوفر زہر کے ذریعہ ہلاک کیے گئے ہیں۔

چار سپاہیوں کی ایک ٹیم تمام کاٹجوں میں جا کر تلاشی لینے لگی۔ لیکن زہر اور وہ زہر آزمانے والے قاتلوں کا پتہ نہ چلا۔ تلاشی لیتے لیتے صبح ہوگئی۔ دو سپاہی لاؤڈ اسپیکر لے کر گلوب آرک کے پاس گئے۔ پھر انہوں نے ہمت راؤ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا کہ گلوب آرک کا دروازہ کیوں بند کیا گیا ہے۔ انہیں حکم دیا گیا کہ فوراً باہر آ جائیں۔

گلوب آرک کے لوگ باہر نہیں آئے۔ مگر پورٹ ہول سے چلنے والی گولیاں باہر آئیں۔ اور دونوں سپاہیوں کو چاٹ گئیں۔ اسی وقت دور فضا میں ہیلی کوپٹروں کی آوازیں سنائی دیں۔ تھوڑی دیر بعد دو ہیلی کوپٹر نظر آئے وہ اوپر منڈلانے لگے۔ ایک ہیلی کوپٹر سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ کوئی کہہ رہا تھا۔

"اٹینشن پلیز۔ یہ جزیرہ خالی کرانے کے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ آج شام تک یہاں ہیلی کوپٹر اتارے جائیں گے تاکہ آپ سب اپنے اپنے ملک واپس جا سکیں۔ اس سے پہلے درخواست کی جاتی ہے کہ تمام ہتھیار جزیرے کے کھلے حصے میں لا کر رکھ دیئے جائیں اگر ہماری درخواست کے خلاف تخریبی کارروائی کی جائے گی تو ہم یہاں بمباری کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

اس کے بعد بھی کچھ اور کہا جانے والا تھا۔ مگر اچانک مشین گن سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ ایک ہیلی کوپٹر تیزی سے پرواز کرتا ہوا فرار ہو گیا۔ دوسرا نیچی پرواز کرنے والا فائرنگ کی زد میں آ کر ایک دھماکے سے زمین پر گرا۔ پھر اس میں سے شعلے بلند ہونے لگے۔

مشین گن کو استعمال کرنے والے یہودی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ محض دھمکیاں ہیں۔ جس جزیرے میں دنیا کے اہم ترین افراد موجود ہوں، وہاں کبھی بمباری نہیں کی جائے گی۔ ان کا خیال درست تھا۔ تمام ممالک اس فکر میں تھے کہ اہم افراد کو اور اغوا کیے جانے والوں کو صحیح سلامت جزیرے سے واپس لے آئیں لیکن ان کی سلامتی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

خورشید بلگرامی کی پیش گوئی کے مطابق جاپان میں اس روز زلزلہ آیا۔ بحرالکاہل اور خلیج بنگال میں طوفان آنے کی خبریں ریڈیو کے ذریعہ سنائی جا رہی تھیں۔ شام کو یہ خبریں سننے کے بعد ہاتورا نے کہا۔

"مسٹر خورشید! آپ نے درست کہا تھا۔ وہاں طوفان آ چکا ہے۔ پتہ نہیں میری سومنا کس حال میں ہوگی۔ اب میں کاٹیج میں قیدی بن کر نہیں رہ سکتا۔ اب کھڑکی سے جھانک کر دیکھیں۔ باہر کوئی پہرہ دار بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

وہ دونوں کھڑکی کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ خورشید بلگرامی نے تشویش کا اظہار کیا۔

"سمجھ میں نہیں آتا یہ سب لوگ کہاں چلے گئے۔ ریکریشن ہال کی طرف سے بھی آوازیں نہیں آ رہی ہیں۔ پتہ نہیں روپ وتی کہاں ہو گی۔ کس حال میں ہو گی؟"

ہاتورا نے کہا۔ "تو پھر روپ وتی کی ہی خاطر آپ میرے ساتھ باہر چلیں۔ ہمیں کچھ کرنا چاہیئے۔"

"ہاتورا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم خالی ہاتھ باہر جا کر کیا کرو گے اس طرح نہ تم سومنا تک پہنچ سکو گے اور نہ میں ایک بیٹی کو پا سکوں گا"

اس کی بات ختم ہوتے ہی تین سپاہی نظر آئے۔ وہ مشین گن اٹھائے گلوب آرک کی طرف جا رہے تھے۔ کاٹیج نمبر ایک سے پچاس گز دور جا کر وہ مشین گن کو اس کے اسٹینڈ پر رکھنے لگے۔ گن کا رُخ گلوب آرک کی جانب تھا۔ انہوں نے اپنے سامنے ریت کے تھیلے رکھ لیے تھے۔ اب ایک سپاہی للکار کر کہہ رہا تھا۔

"ہم آخری بار کہتے ہیں۔ باہر آ جاؤ۔ ورنہ ہم مرنے سے پہلے گلوب آرک کو تباہ کر دیں گے۔"

گلوب آرک کا دروازہ پہلے ہی بند ہو چکا تھا لیکن اس کے پورٹ ہول سے فائرنگ ہونے لگی۔ جواب میں اسٹین گن سے گولیاں برسنے لگیں۔ پورٹ ہول خالی ہو گیا۔ ایک سپاہی دوڑتا ہوا گلوب آرک سے کچھ فاصلہ پر پہنچ کر ہینڈ گرینیڈ پھینکنے لگا۔ دو گولوں کا دھماکہ گلوب آرک کے باہر ہوا۔ تیسرا گرینیڈ پورٹ ہول کے اندر پہنچ گیا۔ پھر تیسرے دھماکے کے ساتھ اندر سے چیخ و پکار سنائی دی۔ وہ گرینیڈ پیچھے جنریٹر کے پاس جا کر پھٹا تھا۔ ڈیزل آئل نے آگ پکڑ لی تھی اور اب اندر سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔

پہلے تمام پورٹ ہول سے دھواں نکلتا رہا۔ پھر شعلے زبان دکھانے لگے۔ وہ لوگ دھوئیں میں گھٹ کر اور آگ میں جل کر نہیں مر سکتے تھے۔ مجبوراً گلوب آرک کا دروازہ کھول کر فائرنگ کرتے ہوئے باہر نکلے۔ لیکن مشین گن کی گولیوں کی زد میں آ کر گر پڑے چلے گئے۔ ہمت راؤ ایک انجینئر کے ساتھ بھاگتا ہوا گلوب آرک کی لفٹ میں پہنچا۔ دھوئیں کی زیادتی کے باعث دونوں کھانس رہے تھے۔ لفٹ ساتویں منزل کی طرف جا رہی تھی۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ اوپر جا کر بزرویٹری کی چھت کھول کر گلوب آرک کے دوسری طرف سمندر میں چھلانگ لگانا چاہتے تھے۔

لیکن پانچویں منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ لفٹ راستے میں ہی رک گئی۔ گولے بارود کے اسٹور تک آگ پہنچ گئی تھی۔ اس لیے دھماکے پر دھماکے ہو رہے تھے اور اب دھواں لفٹ کے اندر پہنچ رہا تھا۔ وہ دونوں لفٹ کی دیواروں پر چاروں طرف ہاتھ مار رہے تھے۔ اور کھانستے جا رہے تھے۔ وہ کسے مدد کے لیے پکار رہے تھے؟ جو چاہتے تھے اور بُرے وقت پر کام آنے والے تھے۔ انہیں تو وہ پرانی دنیا میں چھوڑ آئے تھے۔

کھوں۔ کھوں۔ کھوں...... ہمت راؤ نے کھانستے ہوئے اپنے سامنے شنکر کو دیکھا۔ وہ ہاتھ میں کھانسی کی دوا پکڑے کہہ رہا تھا۔

"پتاجی! یہ دوا پی لیں۔ کھانسی کم ہو جائے گی۔ آپ کو بخار بھی ہے۔ میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

چشمِ تصور میں ڈاکٹر آ رہا تھا۔ اسے دوائیں کھلا رہا تھا۔ شنکر تمام رات باپ کے سرہانے بیٹھا جاگ رہا تھا۔ کھوں۔ کھوں کھوں..... کھانستے ہوئے دماغ نے کہا۔

"ٹھیک ہے کہ وہ میرا بیٹا نہیں تھا۔ مگر بیٹا تو یہ جانتا تھا کہ میں ہی اس کا باپ ہوں۔ پشپا اور بلدیو نے صرف مجھے ہی نہیں شنکر کو بھی دھوکے میں رکھا تھا۔ ہم دونوں ہی فریب خوردہ تھے۔ پھر میں نے اس معصوم بچے کو فریب کیوں دیا۔ وہ پرایا تھا مگر میرا تھا۔ اس کی آتما میرے ہی لیے تڑپتی تھی۔ میری دکھ بیماری میں وہی راتوں کو جاگتا تھا...... بیٹے! تم کہاں ہو؟ دیکھو میں بیمار ہوں۔ ایک بار آ جاؤ۔ جوان بیٹے کی گود میں مرتے ہوئے میری آتما کو سکون ملے گا۔ کھوں کھوں۔ کھوں...."

لفٹ کی تنگ قبر میں کھانسی آہستہ آہستہ مرتی جا رہی تھی۔ پھر وہ لفٹ چتا کی آگ بن گئی۔

رات کی تاریکی میں گلوب آرک کے شعلے جزیرے کو دور تک روشن کر رہے تھے اور دھمکی دے رہے تھے کہ ابھی اس کے آہنی ڈھانچے کے پیتھڑ سے اڑنے والے ہیں۔ تینوں سپاہی مشین گن اٹھا کر وہاں سے دور بھاگنے لگے۔ خورشید بلگرامی اور ہاتورا نے فرار ہونے کے لیے کاٹیج کا پچھلا دروازہ کھولا۔ وہاں ارسلا اور نیگرو حسینہ کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور اور اسٹین گن دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئے۔ ارسلا نے اسٹین گن ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لیجئے۔ ہم کل رات سے یہاں پہنچنے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ اس گلوب آرک کے دھماکوں سے دشمن بھی بوکھلا گئے ہیں۔ اس طرح ہمیں یہاں آنے کا موقع مل گیا۔ یہاں سے دور بھاگ چلو۔"

ہاتورا نے اسٹین گن لے لی۔ خورشید بلگرامی نے ریوالور لے کر ان کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"روپ وتی کہاں ہے۔ کون سے کاٹیج میں ہے۔ کیا تم جانتی ہو؟"

ارسلا نے کہا۔ "مسٹر خورشید! وہ آپ کے سامنے نہیں آنا چاہتی۔ اگر اس سے سامنا ہو جائے تو میری درخواست ہے کہ آپ اسے بیٹی نہ کہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ کیا کسی کو بیٹی کہنا جرم ہے؟"

"جرم ہی سمجھ لیں۔ دیکھیے وہ بہت پریشان ہے۔ کہتی ہے اُسے زندگی سے بہت پیار تھا۔ اب نہیں ہے۔ آپ یقین کریں کہ وہ اپنی موت کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ جان بوجھ کر فائرنگ کی زد میں آ جائے۔"

"میں اسے مرنے نہیں دوں گا۔ مجھے بتاؤ وہ کس کاٹیج میں..."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ وہ تیزی سے بھاگنے لگا۔ اب گلوب آرک کا بیرونی ڈھانچہ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا۔ فولادی چادریں شعلوں میں لپٹی ہوئی فضا میں سنسناتی ہوئی جزیرے کے سر پر اڑ رہی تھیں۔ دُمدار ستارہ بالکل اسی انداز میں شعلہ فشاں ہو کر زمین سے ٹکرانے والا تھا۔ قیامت اس طرح نہیں آئی۔ اس طرح آ رہی تھی۔ گلوب آرک کے سلگتے ہوئے ٹھوس ٹکڑے جزیرے کی چھاتی کو داغ رہے تھے۔ زمین لرز رہی تھی۔ لوگوں کی آخری چیخیں گونج رہی تھیں۔ خورشید بلگرامی نے پلٹ کر دیکھا تو ارسلا ایک جلتے ہوئے ٹکڑے کی زد میں آ گئی تھی۔ روپ وتی کا پتہ بتانے سے پہلے ہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

دور دور تک چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں آگ بکھری ہوئی تھی ریکریشن ہال اور کتنے ہی کاٹجوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ہاتورا بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ چیختے ہوئے، روپ وتی کو پکارتے ہوئے کاٹجوں کی طرف بھاگنے لگا۔ جزیرے کے دور افتادہ حصہ میں دو کاٹیج ابھی آگ کی زد سے محفوظ تھے۔ وہ اندھا دھند دوڑتا ہوا ایک کاٹیج میں گھس گیا۔ اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ کوئی دشمن اسے گولی مار دے گا۔ وہ ایک ایک کمرے میں جھانکتے ہوئے چیخنے لگا۔

"روپ وتی! تم کہاں ہو؟ جواب دو۔ مجھ سے نہ چھپو۔ ماجدہ کی طرح پردہ نہ کرو۔ ورنہ میں مر جاؤں گا۔"

ہر طرف اندھیرا تھا۔ دور سے لپکنے والے شعلوں سے وہاں کے کمرے کبھی روشن ہوتے تھے اور کبھی تاریکی میں ڈوب جاتے تھے۔ ڈوبتی ابھرتی روشنی میں وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ پھر دوسرے کاٹیج سے فائرنگ کی آوازیں آئیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ خورشید بلگرامی چیختا ہوا اس کاٹیج سے نکلا اور دوسرے

کاٹیج کی طرف بھاگنے لگا۔

دوسرے کاٹیج کے ایک کمرے میں دیے ڈوبتے ابھرتے شعلوں کی روشنی تھی۔ ہاتورا فرش پر پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔ اس کی قمیض شانہ سے سینے تک اس کے لہو میں بھیگ رہی تھی۔ روپ وتی اس پر جھکی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" وہ مجھ پر گولی چلا رہا تھا۔ تم سامنے کیوں آگئے؟"

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "خورشید صاحب نے پیش گوئی کی ہے کہ میں اپنی سومنا سے ضرور ملوں گا۔ پھر میں کیسے نہ اپنا لہو بہا کر ان کی بیٹی کی حفاظت کرتا۔ میرے شانے پر گولی لگی ہے۔ میں نہیں مروں گا۔ میں سومنا سے ملوں گا۔ پیش گوئی جھوٹی نہیں ہوگی۔ روپ وتی میری بات مان جاؤ۔ اسے بیٹی کا پیار دے دو۔ نہیں تو ماجدہ کی شرم اس دکھی باپ کو مار ڈالے گی۔"

یہ کہتے کہتے وہ بیہوش ہوگیا۔ اسی وقت خورشید بلگرامی کی آواز سنائی دی۔ روپ وتی نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر دوڑتی ہوئی آئی اور دروازے کو اندر سے بند کردیا۔

"روپ وتی! تم کہاں ہو؟" وہ ویران جزیرہ جیسے گنبد کی صدا بن گیا تھا۔ ایک باپ کی آواز زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ "تم کہاں ہو؟ کہاں ہو۔ کہاں ہو، ہو۔ ہو۔ ہو۔ ہو......"

وہ بند دروازے کے سامنے آکر ٹھہر گیا۔ پھر دروازے کو پیٹتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں جانتا ہوں تم یہاں ہو۔ میری بچی! میری جان! مجھے ماجدہ تک پہنچنے میں دیر ہوگئی تھی۔ تم میری اس تاخیر کی تلافی کردو۔ میں تمہیں تلاش کرتا آرہا ہوں۔ اس بار میں نے دیر نہیں کی۔ پھر تم دروازہ کیوں نہیں کھول رہی ہو؟"

بند دروازے کے پیچھے اس کی آہیں اور سسکیاں سنائی دیں۔ پھر وہ آنسو بھرے لہجے میں بولی۔

"میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

"میں دروازہ توڑ دوں گا۔"

"اس سے پہلے ہی میں جان دے دوں گی۔ میں آپ سے آنکھیں نہیں ملا سکتی۔ نہیں ملا سکتی۔ آپ باپ بن جاتے ہیں مگر بیٹی کی شرم کو نہیں سمجھتے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ تمہیں بھی سمجھاتا ہوں۔ بیٹی وہ ہوتی ہے کہ جسے دیکھ کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم احتراماً اٹھ کر کھڑے ہوجاتے تھے۔ بیٹی! میری آنکھوں میں اتنے آنسو ہیں کہ تمہارے دامن کے تمام داغ دُھل جائیں گے......"

وہ چپ ہوکر سننے لگا۔ اندر سے کرسی گھسیٹنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ چشم تصور وہی منظر دکھا رہی تھی۔ ماجدہ کرسی پر چڑھ کر چھت کی شہتیر سے رسّی باندھ رہی تھی۔ وہ دیوانہ وار دروازے پر ٹکریں مارنے لگا۔

پہلی ٹکر ــــ بول میری بے شرم تقدیر! ایک باپ کب تک جوانی کے دلالوں سے ٹکراتا رہے گا؟

دوسری ٹکر ــــ بول میرے غیرت مند ضمیر! اب تو قیامت بھی گزر گئی۔ اب تو شرافت کا کچھ صلہ ملنا چاہیئے۔

تیسری ٹکر ــــ خدایا! عورت کے ایک رشتہ کو اتنی بے حیائی نہ دے کہ تہذیب مر جائے۔ عورت کے دوسرے رشتہ کو اتنی حیا نہ دے کہ وہ پھانسی پر چڑھے اور باپ کا کلیجہ پھٹ جائے۔

ٹکر پہ ٹکر ــــ کوئی چارہ نہیں۔ دوا درد سے نہیں ٹکراتی۔ دعا آسمان سے نہیں ٹکراتی۔ آں۔ نہیں۔ ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ دعا اثر رکھتی ہو تو آسمان سے ضرور ٹکراتی ہے۔ ہاتورا نے نیم بیہوشی کی حالت میں کراہتے ہوئے کروٹ بدلی۔ پھر دھندلائی ہوئی آنکھوں کے سامنے روپ وتی نظر آئی۔ وہ کرسی پر کھڑی ہوئی رسی کے پھندے کو گلے میں ڈال رہی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر تکلیف کی شدت سے اٹھ نہ سکا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ دو قدم چل کر روپ وتی کو خودکشی سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔

اچانک اسے اپنی پیٹھ کے نیچے کوئی سخت سی چیز محسوس ہوئی۔ اس نے ٹٹول کر دیکھا تو اس کا اپنا ریوالور ہاتھ آگیا۔ اسی وقت روپ وتی نے اپنے پاؤں کے نیچے کرسی کو ٹھوکر ماری۔ ٹھائیں ٹھائیں دو گولیاں چلیں۔ رسّی بیچ سے ٹوٹی اور وہ چیختی ہوئی فرش پر آگری۔ دروازہ ٹوٹ رہا تھا۔ ہاتورا ہاتھ میں ریوالور لیتے تکلیف کی شدت کے باوجود مسکرا رہا تھا۔ روپ وتی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ دروازہ ٹوٹنے کی آواز آئی تو اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ چند لمحوں بعد اسے اپنے شانوں پر محبت کے دو ہاتھ محسوس ہوئے۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ پھر اسے کانوں کے قریب باپ کی وہ آواز سنائی دی جو سات برس کی غلاظتوں میں گم ہوگئی تھی۔

"بیٹی! تم شرم سے مرو گی۔ میں صدمہ سے مروں گا تو بدی کے خلاف کون جنگ کرے گا؟ ہمیں زندہ رہنا ہے بیٹے! ہمیں اس دنیا کو خوبصورت بنانا ہے۔ اور ہم بنائیں گے۔ بولو، میں بیٹی کی کو اور تم باپ کی دنیا کو خوبصورت بناؤ گی نا؟"

وہ تڑپ گئی۔ پھر پلٹ گئی۔ پھر "پتاجی" کہہ کر چیختی ہوئی باپ کے سینے سے لگ گئی۔ کوئی تو ایسا سینہ ہو جہاں بیٹیاں سر رکھ کر آنسوؤں کا بوجھ ہلکا کر سکیں۔

وہ آنکھوں سے بوجھ ہلکا کر رہی تھی۔ باہر جزیرے پر امداد ہیلی کاپٹر پرواز کر رہے تھے۔